انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

حیاتِ نو

مدیر: ابوالاعلیٰ سید سبحانی

جلد:۲۹، شمارہ:۳، جولائی۔ستمبر ۲۰۱۵ء/رمضان المبارک۔ذوالحجہ ۱۴۳۶ھ

مجلس ادارت

محمد اسماعیل فلاحی .... علی گڑھ

سید راشد حامدی فلاحی ...... نئی دہلی

زبیر ملک فلاحی .... لکھنؤ

انیس احمد فلاحی .... جامعۃ الفلاح

فی شمارہ	: اندرون ملک	۳۰/روپے
	بیرون ملک	۵/امریکی ڈالر
سالانہ زرتعاون	: اندرون ملک	۱۲۰/روپے
	بیرون ملک	۲۰/امریکی ڈالر
لائف ممبرشپ	: اندرون ملک	۳۰۰۰/روپے
	بیرون ملک	۲۰۰/امریکی ڈالر

- رجسٹرڈ ڈاک سے رسالہ منگانے کی صورت میں رجسٹری خرچ بذمہ خریدار ہوگا۔
- مقالہ نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

خط وکتابت کے پتے

برائے ادارتی امور

ابوالاعلیٰ سید سبحانی، نئی دہلی

شاہین باغ، جامعہ نگر، اوکھلا، نئی دہلی ۲۵

+91-9891051676

abulaalasubhani@gmail.com

برائے انتظامی امور وترسیل زر

سید راشد حامدی فلاحی

شاہین باغ، جامعہ نگر، اوکھلا، نئی دہلی ۲۵

+91-9811126467

s.rashidhamidi@gmail.com

نقوشِ حیات

ادار یہ	ابوالاعلی سید سبحانی	۳
نفرت سے محبت تک	نسیم احمد غازی فلاحی	۵
ہمارے زمانے کا جامعہ	عبدالحق فلاحی	۹
ہجرت رسولؐ اور خانوادۂ صدیقؓ	جوہر جاوید	۲۴
بچوں کی تربیت کے لیے مطلوبہ لٹریچر: صورتحال اور امکانات	تنویر آفاقی فلاحی	۲۹
	سعید اختر اعظمی (فلاحی)	۳۰
	خبیب کاظمی (فلاحی)	۳۱
	سالم سلیم فلاحی	۳۶
	محمود عاصم فلاحی	۳۷
	محمد اکمل فلاحی	۳۸
	سید محمد سلمان فلاحی	۳۹
	مروہ سبحانی فلاحی	۴۱
	عمار جاوید القسوری	۴۲
اردو تراجم قرآن پر ایک نظر (۹)	ڈاکٹر محی الدین غازی	۴۴
یا ابا اللیث!	شبیر احمد فلاحی	۵۵
پھر چھیڑا 'روایات' نے اپنا قصہ!	ڈاکٹر امتیاز وحید	۵۸
حاجی عبدالرزاق اسماعیل کالسیکرؒ	عبدالبر اثری فلاحی	۶۷
شعر و نغمہ	سید راشد حامدی فلاحی، عارف آئمی، عزیز نبیل، سعید اختر اعظمی، ارشد جمال صارم، محمد امین احسن	۷۲
تعارف و تبصرہ	ضمیر الحسن خاں فلاحی، عشرت مجیب	۷۸
آپ کے خطوط	قارئین	۸۰
جامعہ کے لیل و نہار	مصباح الباری فلاحی	۸۲
اخبار انجمن	ادارہ	۸۹

اپنی بات

حالیہ دنوں میڈیا میں ایک خبر نوبل امن پرائز کے سلسلے میں یہ آئی کہ اس کے لیے پیش کردہ ناموں کی فہرست میں مصر کے باغی فوجی حکمراں عبدالفتاح سیسی کا نام بھی شامل ہے۔ سیسی کا نام اقوام متحدہ کے ایک ادارے UNARTS کی جانب سے پیش کیا گیا ہے۔

نوبل امن پرائز کی تاریخ کو دیکھیں تو یقیناً سیسی اس کا 'حقدار' معلوم ہوتا ہے۔ اگر، جیسا کہ غالب گمان ہے، سیسی کے حق میں نوبل امن پرائز کا فیصلہ ہوجاتا ہے، تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ نوبل امن پرائز کی 'تابناک' اور 'روشن' تاریخ کی کچھ ایسی ہی روایات رہی ہیں۔

اس سے قبل ۱۹۷۳ء میں ہنری کسنجر کو یہ پرائز دیا گیا تھا، وہ شاید سیسی سے بھی زیادہ اس کا 'حقدار' تھا، جس نے ویتنام کی جنگ میں خطرناک اور مہلک قسم کے کیمیکل ہتھیاروں کا استعمال کیا تھا، اور ہزاروں ہلاکتوں کا سبب بنا تھا، اور نوبل امن پرائز حاصل کرنے کے بعد بھی وہ اپنے راستے پر 'ثابت قدم' رہا، چنانچہ کمبوڈیا کی جنگ میں اس نے خطرناک خونی کھیل کھیلا۔

اس سے قبل یہ نوبل پرائز مینکم بگن کو بھی دیا گیا، یہ دنیا کی پہلی دہشت گرد تنظیم 'ارگن' کا سرغنہ تھا۔ اس کا ہاتھ بھی خون سے لت پت نظر آتا ہے، اس کے متعدد 'کارناموں' میں یہ بات بھی شامل ہے کہ اس نے ۱۹۴۶ء میں ایک بم دھماکہ کے ذریعے کافی لوگوں کو ہلاک کردیا تھا۔

اس سے قبل یہ نوبل پرائز اسرائیلی وزیر اعظم شمعون پیریز کو بھی دیا گیا، جس نے دنیا میں 'امن کے قیام' کے لیے اسرائیل کو نیوکلیئر طاقت بنانے کا محاذ سنبھالا تھا، اور فلسطین سے لے کر لبنان تک نہ جانے کتنے افراد کے قتل وخون سے اس کا ہاتھ رنگین تھا۔

اس سے قبل یہ نوبل پرائز اسرائیلی ملٹری افسر اضحاک رابن کو بھی دیا گیا، رابن کے بھی بڑے 'کارنامے' ہیں، اس نے ۱۹۴۸ء کے نکبہ میں فلسطینیوں کا جس بے دردی سے قتل عام کیا، اور انہیں جس طرح ان کی اپنی زمینیں اور اپنے علاقے چھوڑ کر چلے جانے پر مجبور کیا، اس سے کون ناواقف ہے۔

اس سے قبل یہ نوبل پرائز امریکی صدر باراک اوبامہ کو بھی پیش کیا گیا، جس نے افغانستان، عراق، پاکستان، لیبیا، مصر، شام اور دنیا کے مختلف ممالک میں 'قیام امن' کے سلسلے میں جو 'عظیم کارنامے' انجام دیئے، اور دنیا میں 'حقیقی جمہوریت' اور 'حق وانصاف کے قیام' کے لیے جو 'اقدامات' کیے ہیں، ان سے کون ناواقف ہوگا۔

ایک انگریزی مصنف ہے Fredrik Heffermehl، اس نے ۲۰۱۰ء ایک کتاب لکھی تھی، Nobel Peace Prize: What Nobel Really Wanted جس میں اس نے

۱۹۰۱ء سے لے کر ۲۰۰۹ء تک جن افراد یا اداروں کو نوبل امن پرائز دیا گیا، ان کا اچھا تجزیہ کیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ گزشتہ دس پرائز میں سے ایک کو چھوڑ کر باقی تمام پرائز غیر قانونی اور ناجائز ہیں۔

یقیناً عبدالفتاح سیسی کو یہ نوبل امن پرائز ضرور ملنا چاہئے، اس لیے کہ

اس نے عالم اسلام کی عظیم ترین اسلامی تحریک 'اخوان' کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کا بیڑا اٹھا رکھا ہے۔

اس نے اسرائیل کے ناپاک وجود کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے ہر ممکنہ کوشش کر ڈالی ہے۔

اس نے فلسطینی مجاہدین کی کمر توڑ دینے، خاص طور پر غزہ کے آزادی پسند اور خوددار عوام پر عرصۂ حیات تنگ کر دینے کے لیے اسرائیل کے ہر منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کا کام کیا ہے۔

اس نے مصر کی پہلی منتخب جمہوری حکومت کے خلاف بغاوت کرتے ہوئے، وہاں کی منتخب جمہوری حکومت کی جگہ اسرائیل نواز باغی فوجی حکومت کو مسلط کرنے میں اپنے مغربی اور عربی آقاؤں کی ایک ایک ہدایت کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی ہے۔

اس نے رابعہ اور نہضہ کے میدانوں اور وہاں کے گلی کوچوں میں اپنے ہی ملک کے آزادی پسند اور پرامن جدوجہد کررہے عوام کا دن دہاڑے قتل عام کر کے، انہیں اس بات کا یقین دلانے کی ٹھان لی ہے کہ وہ آزادی کے لیے نہیں بلکہ غلامی کے لیے پیدا ہوئے ہیں، اور مغرب کی غلامی کے علاوہ ان کے سامنے کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔

اس کے 'کارناموں' کی فہرست طویل تر ہے، یقیناً وہ اس بات کا 'حقدار' ہے کہ اسے نوبل امن پرائز دیا جائے، اور جس جس طرح نوازا جانا ممکن ہو، اس کو نوازا جائے، کہ یہ اس کی اپنے 'زمینی آقاؤں' کے لیے اس 'کھلی اور غیر مشروط وفاداری' کا بہت چھوٹا صلہ ہے۔

اس کو اس بات کا صلہ دیا جائے کہ

اس نے مصر میں 'امن کے قیام' کے لیے 'غیر معمولی کوششیں' کی ہیں۔

اس نے مصری قوم کو آزادی اور انصاف جیسے 'بڑے خطرات' سے نجات دلائی ہے۔

اس نے مصر کے عوامی انقلاب کو اس کے مقاصد میں 'کامیاب' کرنے کی ہر طرح سے کوشش کر ڈالی۔

اس نے 'دہشت گردی' اور 'دہشت گردوں' سے نہ صرف مصر، بلکہ اس پورے خطے کو محفوظ رکھنے کے لیے کافی 'سعی و جہد' کی ہے۔

اسے اس بات کا صلہ دیا جائے کہ۔۔۔ اس کی فوجی بغاوت کے بعد مغربی اور عربی، بین الاقوامی اور علاقائی وہ تمام 'چہرے' کھل کر سامنے آ گئے، جن پر 'جمہوریت'، 'انصاف'، 'حقوق انسانی' یا 'خدمت اسلام' اور 'خدمت حرمین' وغیرہ وغیرہ کتنے ہی جھوٹ اور فریب کے پردے پڑے ہوئے تھے۔

(ابوالاعلی سید سبحانی)

نفرت سے محبت تک

نسیم احمد غازی فلاحی، اسلامک ساہتیہ ٹرسٹ، نئی دہلی۔
ای میل: isahityatrust@gmail.com موبائیل نمبر:09213134150

میری ایک غیر مسلم بہن دہلی میں قیام پذیر تھیں۔ میں ملاقات کے لیے اکثر ان کے گھر جایا کرتا تھا۔ ان کو اور ان کے گھر والوں کو اس پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ بلکہ میرا وہاں جانا ان کے لیے خوشی کا باعث ہوتا تھا۔ کبھی کبھی میں ان کے یہاں رات میں قیام بھی کر لیتا تھا۔ ان کے پاس اپنا ذاتی مکان نہیں تھا۔ وہ کرائے کے مکان میں اپنے بال بچوں کے ساتھ رہتی تھیں۔ انہوں نے اپنی ضرورت کے پیش نظر نسبتاً ایک بڑا مکان کرائے پر لیا اور اس میں منتقل ہوگئیں۔ یہ نیا مکان جن صاحب کا تھا وہ پیشے سے وکیل تھے۔ وکیل صاحب اسی مکان کے ایک حصے میں اپنی فیملی کے ساتھ رہتے تھے۔ میں اپنی بہن سے ملنے کے لیے اس نئے مکان میں گیا اور کافی دیر وہاں ٹھہرا۔ نماز کا وقت ہونے پر وہیں پر میں نے نماز بھی ادا کی۔ وکیل صاحب کی بیوی نے مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھ لیا۔ جب میں وہاں سے واپس آ گیا تو انہوں نے میری بہن سے میرے بارے میں دریافت کیا۔ بہن نے سب کچھ ان کو بتا دیا۔ انھوں نے اپنے مشاہدے کی بنیاد پر ان کو یہ بھی بتایا کہ اسلام ایک اچھا دھرم ہے، جو اپنے ماننے والوں کے اندر خوشنما تبدیلی لاتا ہے اور ان کے اندر اوصافِ حمیدہ پیدا کر دیتا ہے۔ مالک مکان کی بیوی نے یہ پوری بات اپنے شوہر کو بتائی اور کہا کہ یہ بات خطرے سے خالی نہیں ہے کہ کوئی مسلمان ہمارے گھر میں آئے اور یہاں قیام کرے۔ یہ بات مزید دکھ اور افسوس کی ہے کہ ایسا شخص ہمارے مکان میں آئے جو ہندو سے مسلمان بن گیا ہو۔ یہ تو ہمارے لیے بڑے شرم اور بے عزتی کی بات ہے۔ ہمیں ہر قیمت پر اسے روکنا ہوگا۔ اگر یہ بات ہمیں پہلے معلوم ہوتی کہ ہمارے کرائے دار کا کوئی عزیز مسلمان بن گیا ہے تو ہم ہرگز اپنا مکان اسے کرائے پر نہیں دیتے۔

مکان مالک (وکیل صاحب) کے علم میں جب یہ بات آئی تو وہ غصے سے آگ بگولہ ہو گئے اور فوراً ہماری بہن کے پاس گئے۔ بہن سے انہوں نے دھمکی بھرے انداز میں کہا کہ میرے مکان میں کوئی مسلمان نہیں آ سکتا اور وہ تو بالکل نہیں جو ہندو سے مسلمان بنا ہو۔ مجھے مسلمانوں سے سخت نفرت ہے اور

میں نہیں چاہتا کہ کوئی مسلمان میرے گھر میں آئے۔ آئندہ اگر آپ نے اپنے مسلمان بھائی کو یہاں بلایا یا وہ خود یہاں آیا تو میں اپنا مکان آپ سے خالی کرالوں گا۔

میری بہن نے فون پر مجھے اس صورت حال کی اطلاع دی اور اپنی بے چینی اور پریشانی کا اظہار کیا۔ انہیں یہ کسی طرح گوارا نہ تھا کہ میرا ان کے گھر آنا جانا بند ہو جائے۔ مالک مکان کے اعتراض اور دھمکی سے وہ بہت فکر مند ہوگئیں۔ میں نے اپنی بہن کو تسلی دیتے ہوئے صبر وتحمل سے کام لینے کی تلقین کی اور انہیں امید دلائی کہ خدا نے چاہا تو اس کا کوئی نہ کوئی حل ضرور نکل آئے گا۔ اس صورت حال سے فکر اور تشویش مجھے بھی تھی اور میں اپنی جگہ اس بات پر غور کرنے لگا کہ یہ مسئلہ کس طرح حل کیا جائے۔ اس کا کوئی حل میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میں اللہ سے دعا بھی کر رہا تھا کہ وہ اس کا کوئی حل نکال دے۔

ایک روز ایک بات میرے ذہن میں آئی۔ میں نے اپنی بہن سے فون پر معلوم کیا کہ وکیل صاحب کے گھر سے باہر جانے کے اوقات کیا ہیں؟ انہوں نے بتایا کہ عموماً صبح دس بجے سے شام چھ بجے تک وہ گھر سے باہر رہتے ہیں اور شام کو چھ بجے کے بعد ہی گھر آتے ہیں۔

دوسرے دن صبح گیارہ بجے میں نے اپنی بہن کو فون کیا اور وکیل صاحب کے بارے میں دریافت کیا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ گھر پر نہیں ہیں۔ یہ سن کر میں نے بہن کو اطلاع دی کہ میں آپ سے ملاقات کے لیے آپ کے گھر آ رہا ہوں۔ یہ سن کر وہ گھبرا گئیں اور آنے کے لیے منع کرنے لگیں۔ انہیں اندیشہ تھا کہ میرے وہاں آنے سے کہیں کوئی ہنگامہ کھڑا نہ ہو جائے۔ انہیں وکیل صاحب کی دھمکی یاد آنے لگی۔ میں نے انہیں تسلی دی اور کہا کہ خدا نے چاہا تو سب ٹھیک ہی رہے گا۔ آپ مجھے آنے دیں کیونکہ اس مسئلے کا حل تو نکالنا ہی ہے۔ میں بارہ بجے اپنی بہن کے گھر پہنچ گیا۔ بہن مجھے دیکھ کر بہت گھبرائیں اور پریشان ہوگئیں کہ اگر وکیل صاحب کے علم میں یہ بات آ گئی تو بڑی مصیبت کھڑی ہو جائے گی۔ چنانچہ مجھے بٹھا کر وہ کمرے کا دروازہ بند کرنے لگیں تاکہ وکیل صاحب کی بیوی کی نظر مجھ پر نہ پڑے۔ وکیل صاحب اور میری بہن کا گھر آمنے سامنے تھا اور دونوں کا صحن مشترک تھا۔ میں نے اپنی بہن سے کہا کہ وکیل صاحب کی بیوی کو یہاں بلا لیں میں ان سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ یہ سنتے ہی بہن کی حالت اور زیادہ خراب ہوگئی، جیسے وہ غش کھا کر گر پڑیں گی۔ میرے اصرار پر انہوں نے وکیل صاحب کی بیوی کو بلوا لیا۔ وکیل صاحب کی بیوی نے مجھے ہاتھ جوڑ کر ''نمستے'' کہا جیسا کہ غیر مسلموں میں دستور ہے۔ میرے اشارہ کرنے پر وہ میرے پاس رکھی کرسی پر بیٹھ گئیں۔ دوسری کرسی پر میری بہن بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں نے فوراً اپنا بیگ کھولا اور اس میں سے مٹھائی کے دو ڈبے نکالے، ایک ڈبہ اپنی بہن کی طرف بڑھایا اور دوسرا وکیل صاحب کی بیوی کے سامنے پیش کیا۔ وکیل صاحب کی بیوی نے اسے لینے سے انکار کیا تو میں نے فوراً عرض کیا کہ دو دن قبل ہماری عید تھی۔ عید کے

مبارک موقع پر مجھے اپنی بہن کے لیے مٹھائی پہنچانی تھی۔ مجھے معلوم ہوا کہ یہاں میری ایک اور بہن بھی ہے، اس لیے میں دونوں بہنوں کے لیے مٹھائی لایا ہوں۔ یہ نہیں ہوسکتا تھا کہ ایک بہن کے لیے مٹھائی لاتا اور دوسری کو نظر انداز کر دیتا۔ اس لیے آپ کو اسے قبول کرنا ہی ہوگا۔ میں نے ان سے یہ بھی کہا کہ یہ مٹھائی درگا سویٹ ہاؤس کی ہے (کسی مسلمان کے یہاں کی نہیں ہے) اسے آپ بلا جھجک اور بلا تکلف استعمال کرسکتی ہیں۔ میرے اصرار پر انہوں نے مٹھائی کا ڈبہ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ میں تھوڑی دیر وہاں رُکا اور چائے ناشتے سے فارغ ہوکر جلد واپس آ گیا۔ گھر آ کر میں وکیل صاحب کے ردِّعمل کا انتظار کرنے لگا۔ مگر رات تک بہن کا فون نہیں آیا اور مجھے بھی ان کو فون کرنے کی ہمت نہ ہوئی کہ کہیں کوئی ناخوشگوار بات سننے کو نہ مل جائے۔ دوسرے دن میری بہن کا فون آیا اور انہوں نے مجھے بتایا کہ وکیل صاحب تم سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ آج شام کو ہی تم ان سے ملاقات کے لیے یہاں آ جاؤ۔ میں نے دریافت کیا کہ سب خیریت تو ہے، وکیل صاحب کا ردِعمل کیا ہے؟ بہن نے بتایا کہ بظاہر تو سب ٹھیک ٹھاک ہے، بقیہ تم سے ملاقات پر ہی معلوم ہوگا کہ انہوں نے تمہیں کیوں بلایا ہے اور تم سے کیا بات کرنا چاہتے ہیں۔

شام کو میں وکیل صاحب سے ملاقات کے لیے اپنی بہن کے گھر پہنچ گیا۔ اندر سے میں بھی خوف زدہ تھا کہ کہیں وکیل صاحب کوئی ہنگامہ نہ کھڑا کر دیں۔ بہن بھی بہت ڈری ہوئی تھیں۔ جب وکیل صاحب کو میرے آنے کی اطلاع دی گئی تو وہ خود میرے پاس آئے اور مجھے اپنے گھر لے گئے اور ڈرائنگ روم میں بڑے احترام کے ساتھ بٹھایا۔ چائے ناشتے کا پہلے سے پرتکلف اہتمام تھا۔ انہوں نے بڑی محبت اور خلوص کے ساتھ میری تواضع کی۔ چائے وغیرہ سے فارغ ہوکر وکیل صاحب نے مجھے پاس ہی رکھے ہوئے صوفے پر بٹھایا اور مجھ سے فرمایا کہ بھائی! میں مسلمانوں کے سلسلے میں بڑی غلط فہمی کا شکار تھا اور جب مجھے معلوم ہوا کہ آپ مسلمان ہوگئے ہیں تو آپ سے بھی مجھے سخت نفرت ہوگئی۔ اس لیے میں نے آپ کی بہن سے کہہ کر آپ کے یہاں آنے پر پابندی لگادی۔ واقعی میں نہیں چاہتا تھا کہ آپ کے 'ناپاک' قدم میرے گھر میں پڑیں۔ مگر کل آپ نے خلوص و محبت کا جو رویہ اختیار کیا اس نے مجھے آپ کے بارے میں اپنی رائے بدلنے پر مجبور کر دیا۔ آپ کو علم تھا کہ میں آپ کا دشمن ہوں اور آپ کے یہاں آنے کو پسند نہیں کرتا، اس کے باوجود آپ نے میری بیوی کو اپنی بہن تسلیم کرتے ہوئے اس کو عید کے موقع پر مٹھائی کا تحفہ پیش کیا۔ نیز آپ ہمارے لیے جو مٹھائی لائے وہ کسی مسلمان حلوائی کے بجائے ہمارے جذبات کا لحاظ کرتے ہوئے ہندو حلوائی کے یہاں سے لائے تاکہ ہم اسے استعمال کرسکیں۔ یہ بات آپ کے خلوص و محبت کی عکاسی کرتی ہے۔ اس رویے سے میری بیوی بھی متأثر ہوئی اور میں خود بھی، اور آپ کے بارے میں میری غلط فہمی دور ہوئی۔

وکیل صاحب نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مجھ سے یہ بھی فرمایا کہ یہ مکان آپ کا ہے، آپ

جب چاہیں یہاں آئیں اور جب تک چاہیں قیام کریں، ہمیں آپ کی آمد سے خوشی ہوگی اور آپ کا آنا ہمارے لیے باعث برکت ہوگا۔

وکیل صاحب کے اس خوشگوار ردِّعمل پر مجھے یقیناً بڑی حیرت ہوئی۔ مجھے یہ تو یقین تھا کہ ان کا رویہ میرے سلسلے میں کچھ نہ کچھ ضرور تبدیل ہوگا، مگر وہ اس قدر متأثر ہوں گے اس پر ضرور مجھے حیرت ہوئی اور میں نے دل ہی دل میں ربِ کریم کا شکر ادا کیا، کیونکہ وہی دلوں کو پھیرنے والا ہے۔ وکیل صاحب اپنی بات کہہ چکے تو میں نے ان سے عرض کیا کہ میں نے آپ کے ساتھ جو کچھ بھی کیا ہے وہ صرف اور صرف اس لیے کیا ہے کہ اسلام نے مجھے اسی کا حکم دیا ہے اور ہر مسلمان اسلام کی ہدایت پر عمل پیرا ہونے کا پابند ہے۔ اس کے بغیر وہ مسلمان ہی نہیں۔ میری یہ بات سن کر وکیل صاحب کو بڑی حیرت ہوئی اور انہوں نے مجھ سے ہندی یا انگریزی میں اسلامی لٹریچر طلب کیا۔ اس پوری گفتگو کے دوران وکیل صاحب کی بیوی وہاں موجود رہیں۔ میں جب تک وکیل صاحب کے پاس بیٹھا رہا، اسلام کے مختلف پہلوؤں پر ہی گفتگو ہوتی رہی۔ بعد میں میں نے انہیں اسلامی لٹریچر فراہم کیا۔

بظاہر ایک بڑا مسئلہ اتنی آسانی کے ساتھ حل ہو گیا، یہ کیسے ہوا اور اس کا کریڈٹ کس کو جاتا ہے؟ یہ سوچنے کی بات ہے۔ درحقیقت یہ کرشمہ پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ تعلیمات کا ہے۔ دراصل جب میری بہن نے مجھے بتایا کہ وکیل صاحب نے ایسی ایسی بات کہی ہے تو میں اس کے حل کی تدبیر سوچنے لگا۔ اس دوران پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول میرے سامنے آیا:

''ایک دوسرے کو تحفے دیا کرو کیونکہ بلاشبہ تحفے دلوں کے کینے اور عداوتوں کو ختم کر دیتے ہیں''۔ (ترمذی)

اس قول رسولؐ پر نظر پڑتے ہی میرے دل نے گواہی دی کہ مسئلے کا حل مل گیا۔ وکیل صاحب کے دل میں نفرت اور کینے کی جو آگ بھری ہوئی تھی، میں نے اسے اسی نبوی نسخے کے ذریعے بجھانے کی کوشش کی اور الحمدللہ اس میں کامیابی حاصل ہوئی۔

رب کریم نے قرآن حکیم میں کتنی سچی بات فرمائی ہے کہ ''بھلائی اور برائی برابر نہیں، تم (برائی کو) عمدہ سے عمدہ رویے کے ذریعے دور کرو۔ پھر تم کیا دیکھو گے کہ وہی شخص تمہارے اور جس کے درمیان عداوت تھی وہ ایسا ہو گیا ہے جیسے کوئی جگری دوست ہو''۔ (حم السجدۃ، ۴۱:۳۴) اس آیتِ کریمہ کی صداقت ہم نے اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھ لی۔

قرآن مجید اور پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی بھی ہدایت کو ہمیں ہلکے میں نہیں لینا چاہیے۔ ہمیں یہ سمجھنا چاہیے کہ ان کے اندر بڑی حکمت، تاثیر اور برکت رکھی گئی ہے۔ ●●

ہمارے زمانے کا جامعہ

عبدالحق فلاحی، لندن۔موبائیل نمبر:09899622150

(گزشتہ شماروں میں فضیلت سے فارغ ہونے والے ہمارے فلاحی بھائیوں نے اپنے زمانہ طالب علمی کی کچھ یادیں اور تاثرات ہمارے ساتھ شیئر کیے تھے،اس ماہ ۱۹۷۵ء میں فضیلت سے فارغ ہونے والے ہمارے ایک بھائی کی تحریر پیش خدمت ہے۔ان شاء اللہ اس کالم سے ہمارے لیے ابتدائی دور کے حالات سے واقفیت حاصل کرنے، ابتدائی لوگوں کے خوابوں اور تمناؤں سے آشنا ہونے، اس کی روشنی میں حال کا جائزہ لینے اور مستقبل کے لیے منصوبہ بندی کرنے میں آسانی ہوگی۔ **مدیر***)*

میری تعلیم کے لیے جامعۃ الفلاح کا انتخاب والد مرحوم مولانا محمد یوسف صاحب نے کیا تھا، وہ جماعت کے ایک مخلص کارکن تھے، چنانچہ انہوں نے جماعت کی نظریاتی اور فکری بنیادوں پر قائم ایک درسگاہ کا انتخاب کیا، گو کہ شروع میں ان کا ارادہ مرکزی درسگاہ اسلامی رام پور بھیجنے کا تھا۔

جامعۃ الفلاح کے تعلیمی ریکارڈ کے مطابق جامعہ میں میرا داخلہ ۱۸؍جنوری ۱۹۶۷ء کو درجہ ششم (ثانوی) میں ہوا تھا۔ میں ایک ہندی میڈیم اسکول سے آٹھویں جماعت پڑھ کر آیا تھا، اردو بالکل نہیں آتی تھی اس لیے میرا داخلہ بہت پیچھے یعنی درجہ ششم میں ہوا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ جب میرا ٹسٹ لیا گیا تو بمشکل تمام میں اپنا پتہ اردو میں لکھ سکا تھا۔ درجہ ششم میں ''ہماری کتاب'' حصہ ششم اور فارسی کی دوسری کتاب (حصہ دوم) کورس میں تھی، لیکن اپنی شبانہ روز سعی و جہد سے چھ ماہ میں اپنی ہینڈ رائٹنگ بھی کافی حد تک ٹھیک ٹھاک کر لی اور پھر ششماہی امتحان میں امتیازی نمبرات اور سالانہ امتحان میں کلاس میں دوسری پوزیشن حاصل کی۔ ۱۵؍مئی ۱۹۷۵ء کو سند فضیلت کے ساتھ وہاں سے فارغ ہوا۔ اس طرح جامعہ میں کل مدت قیام ۹؍سال رہی۔

ہمارے داخلہ کے وقت شعبۂ ثانوی کی ایک امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ اس مرحلہ میں جو چھٹی اور ساتویں جماعت پر مشتمل تھا، یو پی بورڈ کے مڈل کا کورس مع اردو، اسلامیات اور فارسی وغیرہ پڑھا دیا جاتا

تھا، اور یہاں کے ساتویں پاس طلبہ کو آس پاس کے اسکولوں میں آٹھویں، نویں کلاس میں داخلہ مل جاتا تھا۔ جامعۃ الفلاح کا یہ ایسا طرۂ امتیاز تھا جس میں میرے علم کی حد تک اس وقت تک کوئی دوسرا مدرسہ شریک نہیں تھا۔

اس شعبہ میں ہمیں بحمد اللہ بہت قابل، محنتی اور مخلص ومہربان اساتذہ اور مربی ملے جو طلبہ کی ہمہ جہت ترقی کے لیے دل وجان سے کوشاں رہتے تھے۔ درجہ ششم میں ہمارے دینیات کے استاذ مولانا شہباز صاحب مرحوم ومغفور تھے جن سے ہمیں پہلا سبق یہ ملا کہ لمبی چھٹیوں سے واپسی پر مدرسہ حاضر ہونے میں ایک دن کی بھی تاخیر نہیں کرنی چاہیے چنانچہ اس سال جب ششماہی امتحان کے بعد تعطیل گرما سے طلبہ واپس ہوئے تو پہلے دن حاضر طلبہ سے مولانا نے یہ عہد لیا کہ بعد میں آنے والے طلبہ کو آج کا سبق نہ بتائیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ لمبی چھٹیوں سے واپسی کے بعد کسے اتنی فکر ہوتی ہے کہ مدرسہ کھلنے کے بعد پہلے دن کیا پڑھایا گیا تھا، پہلے دن حاضر ہونے والے طلبہ نے بعد میں آنے والے طلبہ کو وہ سبق نہیں بتایا۔ مولانا شہباز صاحب نے اس بات کو یاد رکھا اور سالانہ امتحان میں اسی حصے میں سے سوال دے دیا۔ ہم اسے حل نہیں کر سکے کیونکہ ہمیں جواب نہیں معلوم تھا۔ چند سال بعد اس سے بھی کہیں زیادہ سخت تر مرحلہ پیش آیا۔ ہوا یہ تھا کہ تعطیل گرما سے واپسی کے دنوں میں ہولی پڑ رہی تھی۔ ہولی کے ہڑ دنگ کے اندیشے سے ہم دو دن پیچھے ہو گئے، حالانکہ یہ احتیاط ہمارے کام نہ آئی اور اعظم گڑھ ریلوے اسٹیشن پر، اور پھر اعظم گڑھ شہر کے باہری حصہ سے گزرنے پر بھی بلوائیوں نے ہمارے ساتھ بہت برا سلوک کیا جس کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔ خیر مرکھپ کے کسی طرح جامعہ پہنچے تو وہاں نگراں مولانا شہباز صاحب مرحوم کا عتاب نازل ہوا۔ پہلے کلاس میں حاضر ہونے پر پابندی لگائی، پھر چند دن بعد ہاسٹل چھوڑ دینے کے لیے کہا، میں گھٹ گھٹ کر وقت گزار رہا تھا۔ قہر درویش بر جان درویش کا معاملہ تھا۔ میرا حال غزوۂ تبوک میں پیچھے رہ جانے والے تین صحابہ کا سا ہو گیا تھا۔ کچھ طلبہ مجھے غیرت دلاتے تھے کہ کسی اور مدرسہ میں چلے جاؤ، کوئی یہی ایک مدرسہ تھوڑے ہے۔ کچھ ساتھی مدرسۃ الاصلاح چلے جانے کا مشورہ دے رہے تھے۔ میں نے طے کر رکھا تھا کہ پڑھوں گا تو یہیں پڑھوں گا، ورنہ سیدھے گھر چلا جاؤں گا (میرا وطن نوگڑھ ضلع بستی تھا، جو اَب سدھارتھ نگر میں آتا ہے)۔ الغرض، مولانا کو میرے حال پر رحم آیا اور غالبًا ایک ہفتہ کی سخت ذہنی اذیت اور کوفت کے بعد کلاس میں جانے کی اجازت مل گئی۔ اس تربیت کا فائدہ مجھے اپنی سروس لائف میں ملا، چنانچہ پھر کبھی جوابدہی کی نوبت نہیں آئی۔

استاذی المرحوم مولانا شہباز صاحب کے میرے اوپر کچھ اور بھی احسانات ہیں جن کا یہاں ذکر کرنا احسان شناسی اور ''عرفانِ جمیل'' کا تقاضا ہے۔ اوپر گزر چکا ہے کہ اردو سے عدم واقفیت کی بنا پر میرا داخلہ

دوسال پیچھے ہوا تھا، اس لیے اپنی تعلیم کے سلسلے میں سنجیدہ اور یکسو ہونے کے باوجود عام ہم سبق طلبہ سے عمر میں تفاوت میرے لیے عذابِ جان بنا ہوا تھا۔ بابائے اردو، چا چائے فارسی، اور نہ جانے کن کن القابات وخطابات سے طلبہ نوازتے رہتے تھے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ دوسال گزرتے گزرتے پڑھائی سے میری طبیعت اُچاٹ ہونے لگی۔ مجھے یہ خیال ہونے لگا کہ قرآن وحدیث، تراجم، شرحیں، تفسیریں، اور خاصا دینی لٹریچر اردو میں بھی موجود ہے، عربی پڑھنا کیا ضروری ہے، اردو سے بھی کام چل سکتا ہے۔ یہ خیال روز بہ روز پختہ ہوتا گیا یہاں تک کہ ایک دن ہمت کر کے میں نے مولانا شہباز صاحب سے تنہائی میں ملاقات کی اور حال دل کہہ ڈالا۔ انہوں نے بغیر ایک لمحہ تاخیر کے مجھے ڈانٹ کر بھگا دیا۔ پھر وہ دن ہے، اور آج کا دن! میرے اوپر ان کا یہ احسان عظیم کبھی بھلایا نہ جا سکے گا۔ اس راز کا انکشاف آج تقریباً نصف صدی کا عرصہ گزر جانے کے بعد کر رہا ہوں حالانکہ اس واضح تفاوتِ عمر کا فائدہ مجھے یہ حاصل رہا کہ ہاسٹل میں بالعموم مجھے اپنے ہم عمروں یا اپنے سے سینئر طلبہ کے درمیان رہنے کا موقع ملا، جس کا فائدہ مجھے یہ ہوا کہ مجھ سے کوئی غلطی ہوتی تو میرے سینئر اس کی فوراً اصلاح کر دیتے تھے۔ میں اپنے تمام سینئر روم میٹس کا شکر گزار اور احسان مند ہوں۔ اللہ تعالیٰ ان سبھی حضرات کو جزائے خیر دے۔

ان کا ایک احسان میرے اوپر یہ بھی رہا کہ دوران تعلیم مجھے شعر وشاعری کا شوق چرّایا، سلیم تخلص رکھا اور قدیم شعراء جیسے بال بڑھا لیے۔ میری اس ہیئت کذائی پر مولانا شہباز صاحب چٹکی لیتے اور کہتے: کہیے سلیم صاحب! آج تازہ غزل کیا کہی ہے؟ میرے اوپر گھڑوں پانی پڑ جاتا اور خاموشی سے گزر جاتا۔ کبھی غصہ بھی آتا کہ ان حضرت کو مجھ ہی سے کیوں پریشانی ہے، آخر دوسرے طلبہ بھی تو شعر وشاعری کرتے ہیں۔ ایک دن سرِ راہ روک کر کہنے لگے کہ تمہیں معلوم ہے کہ سلیم کے معنی کیا ہوتے ہیں؟ میں خاموش رہا: بولے: سلیم کے معنی ہیں: اَلَّذِیْ لَدَغَتْهُ الْحَيَّةُ یعنی ''جسے سانپ نے ڈس لیا ہو''۔ اس طرح مولانا مرحوم نے مجھے چھیڑ چھیڑ کر شاعری سے باز رکھا اور میرا دھیان سنجیدہ علمی مطالعہ، ادب، تفسیر، تاریخ وغیرہ کی طرف موڑ دیا۔ اللہ انہیں غریق رحمت کرے!

ایک بار میری اور سخت آزمائش ان ہی کے ذریعہ ہوئی۔ اس آزمائش کے شکار دوسرے طلبہ بھی ہوئے۔ ہوا یہ تھا کہ قریبی آبادی کے کچھ نوجوانوں نے مسائل پیدا کیے، تو مولانا نے ہاسٹل کے طلبہ پر یہ پابندی عائد کر دی کہ قریبی آبادی کے لوگوں سے وہ کوئی رابطہ نہیں رکھ سکتے۔ اس ضابطہ کی زد میں میں بھی آیا، حالانکہ نشانے پر دوسرے لوگ تھے۔ یہ میرا پہلا سال تھا۔ مطبخ کا نظام عام مدرسوں سے زیادہ مختلف نہیں تھا۔ کبھی سالن میں سرخ مرچوں کی چٹنی اور کبھی بھینس کا گوشت۔ میں نے بقرعید کی تعطیل میں گھر جانے کی اجازت کافی جدوجہد کے بعد مولانا جلیل احسن ندوی صاحبؒ سے حاصل کی۔ گھر جا کر فریاد کی

کہ کھانا بہت ناقص ملتا ہے۔ چنانچہ والد محترم نے کھانا پکانے کے اسباب ولوازمات مع راشن مجھے گھر سے روانہ کیا۔ کچھ دن خود پکایا کھایا مگر اندازہ ہوا کہ تعلیم خاصی متأثر ہورہی ہے۔اس لیے مدرسہ کے انتہائی قریبی پڑوسی عبدالحمید مرحوم سے معاملہ کیااور وہ صبح شام تازہ تازہ کھانا ٹفن میں لاکردے دیا کرتے تھے۔اس سے نہ مدرسہ اور ہاسٹل کے نظام پر کوئی اثر پڑ رہا تھااور نہ میری اخلاقی حالت پر کوئی برااثر پڑ رہا تھا، بلکہ اب تعلیم اور مطالعہ میں کچھ زیادہ یکسوئی حاصل ہوگئی تھی، میں نے مولانا سے فریاد یا احتجاج کیے بغیر بادل ناخواستہ یہ پابندی قبول کی، اور حسب سابق تمام طلبہ کے ساتھ میس میں کھانا کھانے لگا۔ بعد کے دنوں میں منتظمین جامعہ کی مہربانی سے ایک اچھے ناظم مطبخ میسر آئے اور انہوں نے بڑی مستعدی سے میس کے انتظام کو بہتر بنایااور ہفتے میں دوبار بکرے کے گوشت کاانتظام کیا۔حالانکہ جامعہ میں طلبہ کی بڑی اکثریت فیس خوراکی ادا کر کے کھانے والی تھی اور تھوڑا بہت جو بھی خرچہ آتا تھا سب طلبہ ہی کوادا کرنا ہوتا تھا۔ بہرحال یہ بھی تربیت اور ضابطہ کی پابندی کا ایک مرحلہ تھا جو ہمارے ساتھ گزرا۔

اس ضابطہ کی زد میں وہ لوگ بھی آئے جو مدرسہ کے پیچھے حاجی صاحب کے باغ کے پاس کشتی اور پہلوانی کی مشق کیا کرتے تھے جس میں قصبہ کے نوجوان طلبہ بھی شریک رہتے تھے۔اس دَنگل میں محمد الیاس، فارقلیط صاحب اور محمد فاخر بڑے اہتمام سے حصہ لیتے تھے۔انہیں بھی اس پابندی کا بڑاصدمہ رہا۔

ایک بار ایسا ہوا کہ جمعہ کی صبح خالص دودھ میں میں نے سوئیاں پکائیں اور اپنے ٹھکانے پر اسے رکھ کر غسل کرنے چلا گیا۔ واپس آیا تو سوئیاں پتیلی سمیت غائب! جمعہ بعد موقعہ ملا تو مولانا شہباز صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر شکایت کی۔ اندازہ یہ تھا کہ میری شکایت پر خاطر خواہ توجہ دیں گے اور خاطی طلبہ کی سرزنش کریں گے۔مگر خلافِ توقع انہوں نے مسکرا کر فرمایا: ''تمہارے ساتھیوں نے ہی کھایا ہوگا۔ زیادہ پریشان ہونے کی بات نہیں۔'' پوچھیے مت کہ میری ذہنی اور جذباتی کیفیت کیا رہی ہوگی کہ ایک طرف غصہ سے سینہ اُبل رہا ہے اور دوسری طرف خاطیوں پر گل پاشی ہورہی ہے۔ کسی کی جان گئی، آپ کی ادا ٹھہری۔ مولانا شہباز صاحب کے رویہ سے مجھے اندازہ ہوا کہ اس حادثہ کی بھنک ان کو پہلے سے لگ گئی تھی، اس لیے کسی حیرانی اور غصہ کے بجائے مسکرا کر اسے ٹال دیا ہے۔ بہرکیف، میری تربیت یہ کی گئی کہ کھانے پینے کی چیزوں میں ساتھیوں کا بھی حق ہے اور اگر وہ بغیر پوچھے حلوہ مانڈہ چٹ کر جائیں تو زیادہ برا نہیں ماننا چاہیے، پھر برداشت کی عادت پڑ گئی اور تھوڑا محتاط بھی ہوگیا حالانکہ دوست احباب کی خاطر تواضع کرنے میں پہلے بھی بڑا مزہ آتا تھا اور آج بھی یہی حال ہے۔

مولانا شہباز صاحب کے پاس ایک بار کوئی پکوان تیار کر کے لے گیا تو مولانا نے اسے قبول فرمایا اور خوش ہوئے مگر اس کے ساتھ ایک واقعہ بھی سنایا کہ سالانہ امتحان قریب آیا تو ایک طالب علم ایک پلیٹ

میں مٹھائی لے کر آیا، میں نے اس سے اشارے سے کہا کہ اسے اوپر برتھ پر رکھ دو۔ پھر امتحان ختم ہونے کے بعد جب وہ طالب علم اپنی غرض لے کر آیا تو اسے اشارے سے کہا کہ ''مٹھائی کی پلیٹ وہیں رکھی ہے اسے اٹھالو۔'' مولانا مرحوم میرے مزاج سے واقف تھے اس لیے انہوں نے ازراہِ محبت قبول فرمالیا تھا۔

مولانا شہباز صاحب کا ذکر آئے اور یہ نہ بتایا جائے کہ وہ عام طلبہ پر بھی کتنے مہربان اور شفیق تھے اور ہر ایک کے لئے ان کا صلائے عام جاری تھا، تو یہ اُن کی حق تلفی ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک بہتے ہوئے دریا تھے جس سے ہر پیاسا بقدر ظرف سیراب ہوسکتا تھا۔ وہ ایک ایسے کنواں تھے جس سے بلا امتیاز پسند و ناپسند کے ہر شخص اپنا ڈول ڈال کر پانی نکال سکتا تھا۔ میں نے سنا ہے کہ وہ قیام ندوہ کے دوران عصر بعد ایک کنویں کے پاس بیٹھ کر اپنا فیضِ عام جاری رکھتے تھے، گویا کنویں کے مزاج سے ان کو فطری مناسبت تھی۔

مولانا مرحوم کو بھاری بھرکم بدن کی وجہ سے پٹھوں میں تکلیف رہا کرتی تھی جس کی وجہ سے مالش کی ضرورت رہتی تھی۔ جامعۃ الفلاح میں قیام کے دوران یہ مستقل مشاہدہ رہا کہ مغرب اور عشاء کے دوران طلبہ ان کا تخت سامنے برآمدے میں یا موسم کے مطابق صحن میں نکال کر بستر لگا دیتے اور مولانا اس پر دراز ہوجاتے۔ پھر کیا تھا۔ ایک ایک ہاتھ اور پیر پر کئی کئی طلبہ پل پڑتے اور پھر طلبہ کی طرف سے سوالات کی بوچھار ہو جاتی۔ مولانا سب کا جواب بڑی تسلی اور حکمت سے دیتے اور کسی کو بھی مایوس نہ کرتے۔ سوالات کی نوعیت پر بھی کوئی بندش نہ تھی۔ وہ ہر طرح کے سوال کا جواب دیتے۔ ان دنوں جامعۃ الفلاح کی فضا میں تحریک اسلامی کی فکر کی آبیاری شباب پر تھی۔ نصابِ تعلیم سے لے کر عام گفتگو، مطالعہ اور ہر جگہ جماعتی فکر کا چرچا تھا۔ مولانا مودودی کی فکر، سوچ اور نظریہ پر تنقید کرنا ناقابل تصور تھا۔ مگر مولانا شہباز صاحب کا اللہ بھلا کرے، وہ ذہنی مرعوبیت اور شخصیت پرستی کا قلع قمع کرنے کے لیے مولانا مودودی پر ایسے پہلو سے تنقید کرتے جہاں اس کی گنجائش محسوس ہوتی تھی، مگر یہ انہی کا کام تھا کسی دوسرے کے بس کی بات نہ تھی، طلبہ کا ذہنی افق کشادہ کرنے، تنقید برداشت کرنے، اختلاف رائے کو انگیز کرنے کی تربیت دینے میں مولانا شہباز صاحب کا جواب نہیں تھا۔ ہم طلبہ پر ان کا یہ احسان عظیم ہے۔ اللہ ان کی بال بال مغفرت فرمائے۔ ہمیں انہوں نے وسعتِ فکر، اعلیٰ ظرفی، تواضع وانکساری، حلم وبردباری اور اپنی خدمت آپ کرنے کی تربیت دی، نہ صرف قول سے بلکہ اس کا عملی نمونہ بھی پیش فرمایا۔

ایک بار جامعہ کے سب سے قدیم ہاسٹل حسن البنا منزل کے بیت الخلاء کی ٹنکی بھر گئی اور بیت الخلاء کا استعمال کسی کے لیے ممکن نہ رہا۔ ٹنکی خالی کرنے کا بجٹ بھی اس وقت جامعہ کی مالی حالت کے لحاظ سے خاصا بڑا تھا۔ لوگ سخت پس وپیش میں تھے کہ یہ بلائے ناگہانی کیسے ٹلے اور کہاں سے ''مردے از غیب

بروں آید وکارے بہ کند؟''لوگوں نے دیکھا کہ مولانا شہباز صاحب تسلہ اور پھاوڑا لے کر ٹنکی کے پاس پہنچ گئے اور کام شروع کر دیا۔طلبہ یہ کب برداشت کر سکتے تھے کہ ان کا عظیم مربی ومحسن اور بزرگ استاذ اکیلا یہ خدمت انجام دے، چنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے ڈھیر سارے طلبہ وہاں پہنچ گئے اور چند گھنٹوں کی محنت سے پوری ٹنکی صاف ہوگئی!

اب .... ایسا کہاں سے لائیں کہ تجھ سا کہیں جسے!!

وہ صرف طلبہ ہی پر نہیں بلکہ اساتذہ پر بھی مہربان تھے اور حسب موقع وضرورت اساتذہ بھی ان سے استفادہ کرتے تھے۔

مجھے وہ نظارہ اب تک یاد ہے جب کسی نے ان پر رکیک الزام لگایا اور ان کو معلوم ہوگیا کہ ان کے خلاف سازش ہورہی ہے۔پھر کیا تھا۔درویش صفت اس مرد قلندر نے اپنا بوریا بستر اٹھایا اور اگلی منزل کی سواری کے لیے بلریا گنج چوک کی طرف پیدل چل پڑے۔اور پھر مدرسہ سے لے کر چوک تک طلبہ کا ایک سیلاب تھا جو رُکنے کا نام نہ لے رہا تھا اور ہر ایک کو یہ فکر لاحق تھی کہ کسی طرح اس رُوٹھے ہوئے قلندر صفت مشفق ومہربان استاذ کو واپس لایا جائے۔

حیرت اور افسوس کا مقام ہے کہ رکیک الزام اس بے داغ شخصیت پر لگایا گیا جو اپنے فرض منصبی کی ادائیگی کے لیے راتوں کو اٹھ کر قبرستان کی طرف ٹہل ٹہل کر دوڈھائی بجے شب میں طلبہ کی نگرانی کرتا تھا۔یہ نظارہ خود میں نے طالب علمی کے زمانہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔اس کا ظاہر وباطن کھلی کتاب کی طرح مثل آئینۂ مجلّٰی ومصفّٰی تھا۔جو عابدِ شب بیدار اور تہجد گزار تھا۔اور پھر مولانا شہباز صاحب ندوہ بھی گئے اس عظیم حادثہ کے بعد مولانا مرحوم سے میری ملاقات دارالعلوم ندوہ میں ان کی قیام گاہ پر ۱۹۸۲ء میں ہوئی، جب میں دہلی سے وطن کے لیے عازم سفر تھا۔میں اپنی اہلیہ مرحومہ صبیحہ اور بچے جمیل احمد سلمہ کے ہمراہ ان سے ملنے گیا تھا۔اس ملاقات کی یادگار وہ خط ہے جو مولانا مرحوم پر شائع کتاب (ذکر شہباز، مؤلفہ مولانا محمد اسماعیل فلاحی) میں چھپا ہے۔اور آخری ملاقات اس وقت ہوئی جب دلی کے ''ارُن ہسپتال'' میں ان کے دل کا آپریشن ہوا تھا اور چند روز بغرض آرام مرکز جماعت اسلامی ہند چتلی قبر میں ٹھہرے تھے۔اس دوران الحمدللہ ان کی خاطر تواضع کرنے اور خدمت کرنے کا موقع ملا، واپس لکھنؤ تشریف لے گئے تو ان کا ایک عنایت نامہ ملا جس میں بڑی اپنائیت کا اظہار کیا اور بڑی دعائیں دیں۔

مجھے یہ تو نہیں یاد ہے کہ اس وقت جامعہ میں کل کتنے طلبہ اور اساتذہ تھے۔البتہ ایک دھندلی تصویر یہ ہے کہ اس وقت ہاسٹل میں دوڈھائی سو طلبہ تھے۔تعارف جامعہ میں اساتذہ کی تعداد غالباً ۳۵ رلکھی تھی۔

جامعہ کی صورت حال اسباب ووسائل کی کمی کے باوجود بہتر تھی۔نظم اور ڈسپلن برقرار تھا۔اساتذہ

ایثار پیشہ تھے۔ نہ تو نظامت اور صدارت کے عہدے میں کوئی ایسی کشش تھی کہ لوگ اس کے لے جگت جگاڑ اور فضا سازی کرتے اور نہ طلبہ کی نگرانی کے لیے کوئی معاوضہ یا اعزازیہ مقرر تھا، جامعہ کی نظامت اور صدارت ایسا منصب تھا جس سے لوگ گریز ہی کرتے تھے۔ ٹیوشن کا بھی کوئی تصور نہیں تھا۔ طلبہ کی مشکل حل کرنے اور ان کی رہنمائی کے لیے اساتذہ ہمیشہ دستیاب رہتے تھے اور کوئی بتانے سے منع نہیں کرتا تھا۔

اساتذہ طلبہ کے تئیں مخلص، ہمدرد اور بہی خواہ تھے، انفرادی طور پر بھی وہ طلبہ پر توجہ دیتے تھے۔ طلبہ کی فلاح و بہبود اور ان کی ترقی کے بارے میں سوچتے رہتے تھے اور ان کی ہمہ جہت نشو و نما اور تربیت کے لیے فکر مند رہتے تھے۔

فلاح میں ہماری تعلیم کا پہلا سال تھا، حسن البنا منزل جامعۃ الفلاح کی سب سے قدیم عمارت تھی، اس میں مکتب اور ثانوی کے طلبہ کا قیام تھا۔ مولانا شبیر اصلاحی مرحوم ہمارے نگراں اور مربی تھے۔ انہوں نے بچوں کے لیے نیلے رنگ کا نیکر اور پیلے رنگ کی دبیز بنیان کا یونیفارم صبح کی ورزش کے لیے تیار کرایا تھا اور نماز فجر بعد فوراً ہم طلبہ قبرستان میں نکل آتے اور وہاں باقاعدہ روزانہ .P.T ہوتی تھی۔ اس طرح حفظان صحت کے تعلق سے مولانا شبیر صاحب کا یہ ایسا کارنامہ ہے جس کی آج تک شاید نظیر نہ قائم ہوسکی۔

جب ہم حسن البنا ہاسٹل میں آئے تو دیوریا کا ایک طالب علم اتنا شریر النفس تھا کہ اساتذہ اور طلبہ سب اس کی حرکتوں سے تنگ اور عاجز تھے۔ مولانا شبیر صاحب کی حکمت دیکھئے کہ ایک دن سارے طلبہ کی میٹنگ کر کے ہاسٹل کے لیے مختلف ذمہ داریوں کا انتخاب کرایا اور اس شریر طالب علم کو پورے ہاسٹل کا مانیٹر مقرر کر دیا۔ طلبہ بھی دم بخود تھے کہ مانیٹر تو سب سے زیادہ ہونہار، نیک اور صالح طالب علم ہوتا ہے، یہ کیسا انتخاب ہے؟! ہم نے دیکھا کہ مولانا شبیر صاحب کی اس حسن تدبیر سے اس کے شر سے سب کو نجات مل گئی۔ اور جب اس پر اخلاقی حدود و قیود خود بخود عائد ہوئیں تو اسے یہ پابندی برداشت نہ ہوئی اور وہ مدرسہ چھوڑ کر چلا گیا۔

مولانا شبیر اصلاحی صاحب جامعۃ الفلاح کے سب سے قدیم خادموں بلکہ اس کے بانیوں میں شمار کیے جاتے ہیں، بڑے تجربہ کار، مخلص اور مشاق استاذ تھے۔ مجھے یاد ہے کہ عربی گرامر کا مضمون ان کے ذمہ تھا، کہتے تھے کہ کتاب (قواعد اللغۃ العربیۃ) بند کرو اور سنو۔ قواعد جیسی مشکل چیز کو موم بنا دیتے اور چٹکیوں میں مشکل سے مشکل چیز کو سمجھا دیتے۔ ان کے کلاس میں بیٹھ کر بڑی راحت اور خود اعتمادی کا احساس ہوتا تھا۔

اساتذہ کو اپنی مقدار خواندگی پوری کرنے کی فکر ہوتی ہے مگر مولانا عبدالحسیب صاحب کا کچھ دوسرا

ہی انداز تھا۔ ہم لوگوں کو وہ تفسیر اور ادب پڑھایا کرتے تھے۔ ہم طلبہ کو وہ مستقل اس بات پر آمادہ کرتے رہے کہ دیوان متنبّی نقل کرڈالو۔ ہم عصر بعد پڑھا دیں گے۔ چنانچہ ہم نے بڑے اہتمام سے دیوان متنبّی نقل کیا اور وہ روز عصر بعد اہتمام سے ہمیں دیوان متنبّی پڑھاتے رہے۔ نہ کسی داد کی طلب اور نہ کوئی زائد معاوضہ، کیا خلوص تھا اساتذہ میں!! آج کے وقت میں کسی استاد کے لیے یہ نا قابل تصور ہے کہ وہ طلبہ کو شوق اور ترغیب دے کر زیر درس قرآنی آیات کا حفظ کرائے اور روزانہ پابندی سے اس حصے کو فرداً فرداً سن کر مطالعہ قرآن یا درس قرآن کا سلسلہ شروع کرے۔ چند دن یا چند ماہ تو جوش وخروش میں یہ چیز چل سکتی ہے مگر مستقل سالہا سال تک یہ چیز نہیں چل سکتی۔ مجھے یاد ہے کہ عربی سوم سے لے کر عربی چہارم تک حفظ قرآن کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ ۱۶؍۱۷ طلبہ سے روزانہ آموختہ سننا اور پھر زیر مطالعہ آیات کا درس دینا آسان نہ باشد۔ اس طرح ہم نے سورہ یونس سے سورہ الناس تک حفظ کرڈالا، فالحمدللہ! اللہ تمام اساتذہ کو ایسا شوق اور ولولہ دے۔

شیخ التفسیر حضرت الاستاذ مولانا جلیل احسن ندویؒ نے بھی تدریس کا اپنا ایک منفرد معیار اور وقار قائم کر رکھا تھا جس کو وہ پابندی سے اور سختی سے برتتے تھے۔ بغیر تیاری اور مطالعہ کے وہ کبھی نہیں پڑھاتے تھے۔ جس روز طبیعت ناساز رہتی تھی صاف کہہ دیتے تھے کہ بابا! تم لوگ آج خود پڑھو، میرا مطالعہ نہیں ہے، وہ طلبہ سے متن پڑھواتے اور اس کے معنی تلاش کرنے کی ذمہ داری بھی طلبہ پر ڈال دیتے۔ جہاں دیکھتے کہ طلبہ آگے نہیں بڑھ پارہے ہیں وہاں رہنمائی کر دیتے۔ انہوں نے آموختہ کو اپنے روم پر دہرانے، اگلے سبق کا مطالعہ کرکے آنے، اور ڈکشنری سے مشکل الفاظ کے معانی تلاش کرکے کلاس آنے کی تربیت دی، کہ ہر طالب علم اگلا سبق (قرآن کا، حجۃ اللہ البالغہ کا، مقدمہ ابن خلدون کا) پڑھ کر، تیاری کرکے کلاس میں آئے۔ اس کے لیے مولانا جلیل احسن صاحب مرحوم بڑا جتن کرتے، طرح طرح کی ترکیبیں اور تدبیریں نکالتے، کبھی ایک طرف سے باری مقرر کردیتے تو بغیر باری والے طلبہ مطالعہ گول کر جاتے، کبھی اچانک کسی سے کہتے سبق پڑھو تو اس غریب کو اگلا سبق معلوم ہی نہ رہتا تھا کہ کہاں سے پڑھنا ہے کیونکہ دلچسپی کے محور اور مرکز مختلف ہوتے تھے۔ الغرض، مولانا آئے دن نیا تجربہ کرتے رہتے تھے مگر بیشتر طلبہ کو مولانا کی معذوری، بیماری اور ان کی محبت وشفقت اور دل سوزی وخیرخواہی پر ترس نہ آتا تھا۔

مولانا مرحوم طلبہ کے ذاتی مسائل سے بھی دلچسپی لیتے، خاموشی سے ان کی مدد کرتے، اخلاقی کمزوریوں کی اصلاح فرماتے، فراغت کے بعد معاشی مستقبل کے لیے مشورے دیتے، خود مجھ سے انہوں نے ایک سے زائد بار پوچھا کہ فراغت کے بعد کیا کروگے؟ باہر جاؤ، کچھ وقت کسی دوکان پر بیٹھ کر سوداگری کا ہنر سیکھو۔ میں نے عرض کیا کہ مولانا گھر میں آسودگی ہے، کسی ملازمت یا نوکری کی ضرورت

نہیں ہے۔

مجھے وہ وقت یاد ہے جب نصاب تعلیم میں تبدیلی اور مدتِ تعلیم میں اضافہ کی وجہ سے فضلیت کے سال میں طلبہ نے کلاسوں کا بائیکاٹ کیا اور کئی دن تک کلاسیں نہیں ہوسکیں تو میں نے صدر مدرس مولانا شبیر صاحبؒ اور مولانا جلیل احسن ندوی صاحبؒ کے پاس حاضر ہوکر عرض کیا کہ مجھے ان ہنگاموں سے کوئی دلچسپی نہیں، مجھے اجازت دیں، میں گھر جانا چاہتا ہوں، میرے ان دونوں بزرگ اساتذہ نے میری ڈھارس بندھائی اور مجھے اپنے پاس آ کر بیٹھنے اور مطالعہ کرنے کا مشورہ دیا، اور کہا کہ یہ حالات بھی بدلیں گے اور چند دنوں میں طوفان تھم جائے گا، چنانچہ میں نے باری باری ان دونوں مخلص اور مہربان اساتذہ کے آستانہ پر حاضر ہوکر اپنا مطالعہ جاری رکھا، اللہ ان بزرگوں کو غریق رحمت کرے۔

مولانا کی خدمت خلق، دوراندیشی اور طلبہ کی بہی خواہی کا اعلیٰ نمونہ دیکھئے کہ اپنے پڑوس کی شریف اور غریب بیوہ خاتون کی انہوں نے کس طرح خبر گیری کی، اس بیوہ کی جوان لڑکی کی شادی مدرسہ کے ایک غریب اور ہونہار طالب علم سے کرادی، اللہ کا ایسا کرنا ہوا کہ اس بیوہ اور یتیم بچی کے دن پھر گئے اور اس نوجوان طالب علم نے فارغ ہوکر سسرال کی قسمت بدل دی۔ اللہ اکبر! مولانا مرحوم خود معذور اور چلنے پھرنے سے مجبور تھے لیکن کمزور اور غریبوں کا وہ کتنا لحاظ کرتے تھے! مولانا اپنے خاندان کے لوگوں کی بھی خبر گیری اور دست گیری فرماتے تھے! اللهم كثّر أمثاله۔

مولانا جلیل احسن صاحبؒ نے ایک روز ہم طلبہ کے سامنے یہ واقعہ بیان کیا کہ میں اپنے معاشی مستقبل کے تئیں فکر مند تھا، میں نے خواب میں دیکھا کہ فتاویٰ تاتارخانی میں بہت موٹے موٹے حروف میں یہ عبارت لکھی ہے: لا ينبغي للطالب أن يشتغل بالزارعة والحياكة الخ اس سے مجھے رہنمائی ملی اور ذہن یکسو ہوگیا۔

اوپر میں نے اپنے کئی مشفق و مہربان اور سراپا اخلاص اساتذہ کا ذکر کیا ہے، اور ان کی کرم فرمائیوں کا بھی تذکرہ آیا ہے۔ میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ یہ تعلق یک طرفہ نہیں تھا، طلبہ بھی اپنے بزرگ اساتذہ کی خدمت کو اپنے لیے باعثِ سعادت و کامرانی تصور کرتے تھے، مولانا جلیل احسن صاحب کی معذوری اور پھر ان کی جلالتِ علمی اور فیض رسانی کی وجہ سے بہت سے طلبہ ان کی خدمت کے متمنی رہتے تھے۔ ان کے کمرے میں جھاڑو لگانا، بستر ٹھیک کرنا، جوتے پالش کرنا، ان کی چائے بنانا۔ ان سبھی کاموں کے لیے ایک طرح کا مسابقت کا جذبہ رہتا تھا۔ ایک عرصے تک عبدالحمید صاحب (ضلع بستی) نے مستقل ان کے کمرے میں ساتھ رہ کر ان کی خدمت کی۔ شبیر فلاحی صاحب (مدھنا پار) کی خدمات قابل رشک تھیں، جن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔

جامعۃ الفلاح میں ہمارے داخلہ (۱۹۶۷ء) کے وقت حسب ذیل عمارتیں تھیں:

۲/عمارتیں کچی تھیں، جن میں سے ایک حسن البنا منزل کے شمال مغرب میں واقع تھی جو کھپریل تھی۔ غالبًا یہ جامعہ کی سب سے قدیم عمارت تھی جس میں جامعۃ الفلاح کی ابتدائی شکل مکتب کی صورت میں قائم ہوئی تھی ہمارے زمانے میں یہ مکتب اور ثانوی کے طلبہ کے ہاسٹل کے طور پر استعمال ہو رہی تھی۔ اس عمارت کے جنوبی گوشے میں کبھی ''افضل پریس'' قائم تھا جس میں امتحانی پرچے چھاپے جاتے تھے۔ 'افضل پریس کا تصور یہ تھا کہ چاک مٹی اور گلسرین کا لیپ تیار کر کے بڑے سائز کی سلیٹ پر لگا دیا جاتا تھا۔ مولانا شبیر احمد اصلاحی مرحوم الحمدللہ بہت خوشخط تھے وہ امتحانی پرچوں کی کتابت کر دیتے تھے اور پھر اس کتابت شدہ مواد کو اس سلیٹ پر الٹا چپکا کر امپریشن تیار کر لیا جاتا تھا، اور باری باری چھ سات کاغذوں پر نقش ابھر آتا تھا، اس ''پریس'' کا تصور ماسٹر افضال صاحب (انگریزی ٹیچر ضلع بستی) کا مرہون منت تھا۔ پھر یہ گوشہ کتابت خانہ کے طور پر معروف ہو گیا جس میں برادرم عبدالسلام بستوی اپنی کتابت کے جوہر مولانا شبیر احمد اصلاحیؒ کے تعاون سے دکھاتے تھے، اس کی چوکھٹ پر ہم بھی بیٹھا کرتے تھے، ہم نے جو تھوڑی بہت خوش خطی سیکھی ہے، یہ وہیں سے سیکھی ہے۔ ''افضل پریس'' کے تذکرہ کا مقصد نئی نسلوں کو یہ بتانا ہے کہ ہمارے بزرگوں نے وسائل کی کمی کے مسئلہ کو پرانے وقتوں میں کس طرح حل کیا اور وہ اس کے لیے کتنی محنت اور کس قدر ایثار و قربانی سے کام لیتے تھے۔

اس کچی عمارت اور مولانا مودودی ہاسٹل کے درمیان بہت معمولی اور عارضی قسم کا ٹن شیڈ کا اسٹرکچر مطبخ کا تھا، جہاں ایک پہلوان قسم کا نوجوان باورچی پورا کھانا تیار کرتا تھا۔ دوسری کچی عمارت موجودہ مسجد اور اس کے صحن کی جگہ پر تھی، جو کھپریل تھی اور ایک تسلسل سے کمرہ در کمرہ کا سلسلہ پچھّم سے پورب تک چلا گیا تھا۔ مجھے اس وقت کمروں کی ٹھیک ٹھیک تعداد یاد نہیں ہے۔ اس میں شعبہ ابتدائی (درجہ اطفال تا پنجم) اور شعبہ ثانوی (درجہ ششم و ہفتم) قائم تھا۔ سب سے آخری کمرہ پنجم و ہفتم کا تھا، اس میں ہماری ثانوی تعلیم ہوئی تھی، غالبًا تعمیر مسجد کے لیے اسے منہدم کیا گیا تھا۔ پہلی پختہ عمارت موجودہ مولانا مودودی ہاسٹل کی تھی جو یک منزلہ تھی۔ مودودی ہال میں پنج وقتہ نماز ہوتی تھی۔ اس کے شمال مغربی کمرے میں دفتر تھا جس میں مولانا ممتاز اصلاحی اور منشی منظور صاحب ہمہ وقتی ملازم تھے، منشی سہیل صاحب محصّل تھے۔ مقابل کا جنوبی کمرہ مولانا عبدالحسیب صاحب کی رہائش گاہ تھا۔ ہال سے متصل سامنے کا شمالی کمرہ حضرت استاذ مولانا جلیل احسن صاحب کی قیام گاہ اور کلاس روم تھا، یہاں اونچی کلاسوں کے طلبہ آ کر مولانا کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرتے تھے۔ ہم بھی اس جوئے رواں سے بہت دنوں تک سیراب ہوتے رہے ہیں۔ یہاں مولانا مرحوم کے ہم سبق علماء، اکابرین اور دانشوروں کو مولانا کے سامنے

زانوئے ادب تہہ کرتے دیکھا ہے۔

دوسری پختہ عمارت حسن البنا منزل کی تھی، جو بالکل ابتدائی دور میں ۴۲؍کمروں پر مشتمل یک منزلہ ہاسٹل تھا، جو ملیشیا کے محمد اسحٰق نقوی مرحوم کے عطیہ سے تعمیر ہوا تھا، اور اس زمانے میں کہا جاتا تھا کہ انہوں نے جامعہ کے مکتب کے نصاب میں قاعدہ بغدادی داخل کرنے کی شرط عائد کی تھی، بہرحال اللہ ان تمام مخلصین کی کاوشوں کو قبول فرمائے۔ اس ہاسٹل کے بعض کمرے شروعاتی دور میں عربی درجات کی تعلیم کے لیے بھی استعمال ہوتے رہے اور اس ہاسٹل میں آخر آخر تک ہمارا قیام رہا۔

مولانا مودودی ہاسٹل کی قدیم عمارت کے شمال اور جنوب کا حصہ بعد کی تعمیرات ہیں۔ جو شروع میں تعلیم گاہ کے طور پر استعمال ہوتی تھی اور اب وہ بھی ہاسٹل کا حصہ بن گیا ہے۔ مطبخ کی موجودہ عمارت بعد کی ہے، شروع شروع میں مطبخ کا حساب کتاب اسی دفتر میں رہتا تھا جہاں منشی منظور احمد صاحب اور مولانا ممتاز احمد صاحب بیٹھتے تھے۔

جامعہ کے طلبہ اور اساتذہ کے درمیان الحمدللہ بہت خوش گوار اور پاکیزہ رشتہ تھا۔ اساتذہ کے تئیں طلبہ کے دلوں میں بڑا ادب واحترام پایا جاتا تھا، اور ان کی خدمت کو ہم طلبہ اپنے لیے باعث سعادت تصور کرتے تھے، طلبہ اساتذہ سے سوال اور استفسار تو کرتے تھے مگر بحث وتکرار کی نوبت نہیں آتی تھی۔ بعض دیگر مدارس کے طلبہ نے جامعہ کے اعلیٰ درجات میں داخلہ لیا تو ہم نے اساتذہ کے نام ان کی درخواستوں میں ''فدوی'' لکھا ہوا دیکھا تو حیرت ہوئی، کیونکہ ہمارے یہاں فدا ہونے کا جذبہ تو تھا مگر ''فدوی'' کہنا یا کہلوانا ہماری تہذیب میں شامل نہیں تھا، اور نہ ہمارے مربی اور اساتذہ اس کی تعلیم دیتے تھے۔ فدویت کا مظاہرہ ہم نے مولانا جلیل احسن صاحب کی خدمت میں دیکھا، اس کا اظہار کھل کر اس وقت بھی ہوا جب مولانا محمد عنایت اللہ اسد سبحانی اور مولانا محمد سلامت اللہ اصلاحی صاحبان کے مکانات کی تعمیر کا کام شروع ہوا۔ اس وقت یہ نشیبی کھیت کا علاقہ تھا، مگر قابل مبارک باد ہیں وہ طلبہ جنہوں نے اپنے اساتذہ کی محبت میں رضا کارانہ طور پر اس حصہ کو پاٹنے اور ہموار کرنے میں دل وجان سے حصہ لیا۔

یہ اساتذہ کرام کی اطاعت اور فرماں برداری تھی کہ جب مسجد کی چھت پہلی بار لگی تو ہم طلبہ نے بڑے ذوق وشوق سے چھت پر اینٹیں ڈھوکر پہنچا ئیں اور جو خدمت ہم سے ممکن تھی وہ انجام دی۔ اس سے قبل ہم بیت الخلاء کے سیفٹی ٹینک کی طلبہ کے ذریعہ صفائی کا واقعہ درج کرآئے ہیں جو حضرت الاستاذ مولانا شہباز مرحوم ومغفور کی سرکردگی اور پہل پر انجام پایا۔ اس خوشگوار تعلق اور ادب واحترام کا ایک مظہر یہ بھی تھا کہ اگر کبھی کسی استاذ یا نگراں نے کسی طالب علم کو ہلکی یا سخت سزا دے دی تو کبھی اس کا ردعمل سامنے نہیں آیا، اس سزا کو ایک اصلاحی وتربیتی قدم سمجھ کر انگیز کیا گیا۔

قیام جامعہ کے مقاصد کے پیش نظر جامعہ کا تعلیمی ماحول بھی بحیثیت مجموعی بہتر تھا۔ اساتذہ اپنی ذمہ داریاں ایمانداری اور دیانت داری سے انجام دیتے تھے۔ بہت ناگزیر مواقع پر ہی رخصتیں لیتے تھے۔ طلبہ جب تک مطمئن نہ ہو جاتے اساتذہ آگے نہیں بڑھتے تھے۔ کبھی ڈانٹ کر چپ نہیں کیا جاتا تھا۔ بہت تفصیل کے ساتھ آرام آرام سے پڑھنے پڑھانے کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ منتہی درجات میں مقدار خواندگی پوری نہ ہونے پر امتحان کے قریبی دنوں میں فجر بعد اور عشاء بعد اساتذہ کرام ہمیں بلا لیا کرتے تھے اور اس طرح کورس مکمل کرتے تھے۔

اس احساس ذمہ داری کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ درجہ ششم میں ہماری ریاضی کی کتاب (جو یوپی بورڈ کی ساتویں جماعت میں داخل نصاب تھی) سال میں دو بار دہرائی گئی۔ یہ ایک ریکارڈ ہے جو ہمیں اچھی طرح یاد ہے۔ ماسٹر احمد اللہ صاحب مرحوم جو ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر تھے اور عمر غالباً ستر سال رہی ہوگی، کمر خمیدہ اور چہرے پر جھریاں درازئ عمر کی شاہد تھیں۔ بخار کی حالت میں بھی ناغہ نہ کرتے تھے، وہ قصبہ سے پڑھانے آتے تھے، اور مسلکاً شیعہ تھے۔ ہمارے اس وقت کے ریاضی کے ٹیچر تھے، لیکن اپنے طلبہ کی اخلاقی حالت پر بھی گہری نظر رکھتے تھے، اور اپنے ''مخصوص انداز'' میں اصلاح و تربیت کا کام بھی انجام دیتے تھے، جس سے اختلاف کی گنجائش بہر حال موجود تھی۔

مولانا جلیل احسن صاحب کی تدریس کا ایک منفرد انداز تھا، جو طلبہ ہی سے عبارتیں حل کرواتے تھے۔ مختلف قسم کی ڈکشنریاں، تفسیریں، شرحیں، قرآنی نقشے، سب ان کے روم میں موجود رہتے اور طلبہ کو ان مآخذ و مصادر اور معاجم کے ذریعہ شرح صدر حاصل کرنے کی ترغیب دیتے، یہ سب ان کی ذاتی کتب تھیں جو ان کی وفات کے بعد جامعہ کی لائبریری کو حاصل ہوئیں۔

جامعہ کا تعلیمی ماحول یہ تھا کہ کلاس سے باہر بھی فارغ اوقات میں اساتذہ طلبہ کی رہنمائی اور ان کی مشکلات کے حل کے لیے دستیاب رہتے تھے اور کبھی کوئی منع نہیں کرتا تھا کہ میرے پاس ٹائم نہیں ہے۔ اس زمانے میں ٹیوشن کا تو جامعہ میں تصور بھی نہیں تھا۔

اصلاح و تربیت کے نقطۂ نظر سے اٹھائے گئے بعض قدم طلبہ کے لیے بے حد تکلیف دہ ثابت ہوئے، مثلاً مغرب بعد ہاسٹل میں کوئی طالب علم کسی کے کمرے میں نہیں جا سکتا، اس کا اثر تعلیمی صورت حال میں بہتری کی صورت میں نمودار ہوا، مطالعہ اور ہوم ورک کے لیے طلبہ کو کافی وقت میسر آ گیا۔

تعلیمی مظاہرے بھی تعلیم کے ماحول کو ساز گار اور بہتر بنانے میں معاون بنے۔ ایک بڑا اچھا ڈرامہ بڑے اہتمام سے ترتیب دیا گیا تھا جس میں اقوام متحدہ کا اجلاس طلب کیا گیا تھا اور اس میں سلامتی کونسل کے ممبران کو امن عالم کے قیام کے موضوع پر اظہار خیال کی دعوت دی گئی تھی، مجھے اب تک

ڈرامے کے سین یاد ہیں۔ ڈرامے کے ڈراپ سین (Drop Seen) میں اجلاس کے اختتام پر پردے کے پیچھے سے جب یہ صدا بلند ہوئی کہ ''امنِ عالم پیام خدائی میں ہے، ہم نواؤ! پیام خدا عام ہو''، تو پورا مجمع تحسین و آفریں کی صداؤں سے گونج اٹھا۔ اس ڈرامے کے تخلیق کار غالباً ماسٹر افضال مشہدی صاحب تھے جو عالمیت کے سال میں ہمارے انگریزی ٹیچر تھے۔

اس وقت ارباب فکر و دانش اور جامعہ کے مخلصین کے درمیان یہ مسئلہ زیر بحث رہتا تھا کہ بیک وقت ۱۴/۱۵/ سال کے عرصہ میں عربی زبان اور اسلامیات کے علاوہ سائنس، ریاضی اور دیگر عصری مضامین میں کس طرح مہارت پیدا کی جاسکتی ہے؟

جماعت اسلامی کے ذریعے رام پور میں درسگاہ ثانوی کا محدود پیمانے پر تجربہ کیا گیا، جس سے قابل لحاظ تعداد میں دانشور اور دینی و عصری علوم کے ماہرین نکلے، لیکن یہ سلسلہ بہت دیر تک جاری نہ رہ سکا آخر کیا بات ہے؟ کیا یہ نظریاتی تجربہ نا قابل عمل ہے؟

تربیت کے پہلو سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ جامعہ کا ماحول بحمد اللہ بہتر اور قابل اطمینان تھا۔ تربیت کے ذمہ داران اپنی ذمہ داری مستعدی سے نبھاتے تھے اور یہ خدمت اعزازی تھی۔ طلبہ کی اخلاقی نگرانی کے لیے وقتاً فوقتاً حسب ضرورت نئے ضابطے بھی نافذ کیے جاتے تھے۔ جو لوگ اخلاقی حدود کی پامالی کرتے تھے انہیں سنبھلنے کا کافی موقع دیا جاتا تھا، اور جب اصلاح حال کی ساری تدبیریں ناکام ہو جاتی تھیں تو بدرجہ مجبوری ایسے طلبہ کا اخراج کر دیا جاتا تھا لیکن یہ بادل ناخواستہ ہوتا تھا۔ ایک بار مولانا شہباز صاحب جو نگرانی اور صدارت دونوں ذمہ داریاں ادا کر رہے تھے کسی نے کسی خاص طالب علم کی بے راہ روی سے بددل ہو کر سوال کیا کہ ایسے لوگوں کو کیوں نہیں نکال باہر کیا جاتا، تو مولانا نے جو جواب دیا وہ بڑا مشفقانہ، ہمدردانہ اور حکیمانہ تھا۔ مولانا نے فرمایا: ''اگر ان کو یہاں سے چلتا کر دیا گیا تو وہ باہر جا کر اور بھی برباد ہو جائیں گے۔ آخر ان کے والدین نے ہمارے اوپر بھروسہ کر کے یہاں بھیجا تھا لہٰذا ان کی اصلاح و تربیت کی ذمہ داری ہماری ہے''۔

میرا اپنا ایسا سوچنا ہے کہ تحریکی فکر اور تحریکی فضا نے بھی جامعۃ الفلاح کی اخلاقی تربیت میں نمایاں کردار ادا کیا ہے اور اساتذہ و مربیوں کے اخلاص و دل سوزی اور طلبہ کی فلاح و بہبود کے جذبہ نے اسے صیقل کرنے کا کام کیا۔ اس سلسلہ میں پیچھے ہم مولانا شہباز صاحب اور مولانا شبیر صاحب اصلاحی کے حوالے سے کچھ واقعات کا ذکر بھی کر آئے ہیں۔

میں یہاں اپنے چند مخصوص اساتذہ اور مربیوں کا ذکر کر رہا ہوں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ دوسرے اساتذہ کو میں شمار و قطار میں نہیں رکھتا، انسان کی شخصیت کی تعمیر و ترقی میں چھوٹے بڑے سبھی

اساتذہ اور مربیوں کا کہیں نہ کہیں کوئی کردار ضرور ہوتا ہے۔فرق صرف یہ ہے کہ کسی کی خدمات بہت نمایاں ہوتی ہیں اور کسی کی محدود، اس لحاظ سے یہ سبھی حضرات ہمارے شکریہ وسپاس اور دعا کے مستحق ہیں۔ میں اپنی دعاؤں میں اپنے اساتذہ، مربیوں، امراء جماعت اور اپنے خاص قریبی لوگوں کو مستقل شامل کرتا ہوں۔ثانوی درجات میں میرے اساتذہ ماسٹر عبدالحمید صاحب، ماسٹر رضوان صاحب، اور ماسٹر احمد اللہ صاحب تھے۔ عالمیت وفضیلت کے اساتذہ حضرت الاستاذ شیخ التفسیر مولانا جلیل احسن ندویؒ، مولانا شہباز اصلاحیؒ، مولانا محمد عنایت اللہ اسد سبحانی، مولانا سلامت اللہ اصلاحی، ماسٹر عبداللہ صاحب، اور ماسٹر اکرام الدین احمد صاحب (استاذ نفسیات، نینی۔الہ آباد) تھے۔

قصبہ بلریا گنج کے افراد کا رویہ جامعہ، اس کے طلبہ اور اساتذہ کے ساتھ بہت اچھا تھا، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اس پورے علاقہ کے مسلمانوں کا رویہ مدرسہ اور اس کے طلبہ و اساتذہ کے ساتھ بہتر اور حوصلہ افزا تھا۔اس کا ایک عملی ثبوت تو یہ ہے کہ جب ہماری یونین جمعیۃ الطلبہ کا سالانہ جلسہ ہوتا تھا تو آس پاس کی آبادیوں کے علاوہ دارالمصنفین تک کے ذمہ داران بڑی خوشی اور ذوق وشوق سے شریک ہوتے تھے اور مختلف انداز میں ہم طلبہ کی حوصلہ افزائی کرتے تھے، جمعیۃ الطلبہ کی لائبریری کے لیے الماریوں کی فراہمی، کتب کی فراہمی اور دیگر ضروریات کی فراہمی ان حضرات کے اخلاقی تعاون اور ادارہ سے محبت اور لگاؤ کی روشن دلیل تھی۔ مجھے یاد ہے کہ شاہ معین الدین صاحب ندوی مہتمم دارالمصنفین نے اپنے یہاں کی تمام مطبوعات ہماری لائبریری کے لیے ہدیہ کی تھیں۔اس کا دوسرا عملی ثبوت یہ ہے کہ جن دنوں مسجد زیر تعمیر تھی فنڈ کی کمی کا مسئلہ ہوا، مولانا شبیر اصلاحی مرحوم ومغفور نے عوامی تعاون حاصل کرنے کا بڑا انوکھا اور نرالا نسخہ دریافت کیا اور جب آس پاس کی آبادی سے چندہ لے کر واپس آئے تو ان کے ساتھ بڑی مقدار میں نقدی کے علاوہ زیورات، بغیر سلے ہوئے زنانہ مردانہ کپڑے، لوٹے، کھانے پینے کے برتن، ہانڈی، پتیلی، یہاں تک کہ جس کے پاس پیسے نہیں تھے اس نے مرغی کے انڈے چندے میں دیئے۔جذبات کا ایسا سیلاب امنڈ آیا تھا کہ اللہ دے اور بندہ لے، اللہ تعالی مولانا کو غریق رحمت کرے اور مخلص عوام کی محبتوں اور ان کی بیش بہا قربانیوں کا انہیں اجر عظیم عطا فرمائے۔تیسرا عظیم الشان نمونہ اس علاقہ کی سب سے مخیرّ، انسانیت دوست اور سراپا اخلاص شخصیت محترم حکیم ایوب صاحب کا تھا، جن کے فیض کا ایک سلسلہ تھا، جن کے مطب سے مدرسہ کا کوئی بیمار طالب علم کبھی مایوس ہو کر نہیں لوٹا، وہ چھوٹی بڑی ہر بیماری کا مفت علاج کرتے تھے، وہ کسی کے شکریہ وسپاس کے بھی منتظر نہیں تھے۔طلبہ کے ساتھ انہوں نے دوا علاج کے معاملہ میں کبھی امتیاز نہیں کیا، جو سہولیات اور جو دوائیں ان کے پیڈ مریضوں کے لیے دستیاب تھیں وہ مدرسہ کے عام طلبہ کے لیے بھی مہیا تھیں۔ ۱۹۶۷ء میں میں نے دیکھا کہ حکیم صاحب کے مطب میں قصبہ بلریا گنج اور آس پاس

کے ۲؍۴؍ مریض اور مدرسہ کے دو تین مریض ہوتے تھے، پھر اللہ نے ایسی برکت دی کہ میں نے ستر کی دہائی میں بیک وقت ڈھائی سو مریض گنے جو سیٹوں پر ترتیب سے بیٹھے رہتے تھے اور ہر مریض کو اپنی باری پر دوا ملتی تھی۔ اس کے علاوہ مدرسہ کی ضروریات کے لیے حکیم صاحب کا خزانہ ہمیشہ کھلا رہتا تھا، اللہ انہیں غریق رحمت کرے۔ نقص ہاضمہ کی وجہ سے میری صحت اکثر خراب رہتی تھی۔ حکیم صاحب جب میٹنگ وغیرہ کے لیے مدرسہ پر تشریف لاتے تو مجھے دیکھ کر غصہ ہوتے کہ تم کیوں بیمار رہتے ہو، یقیناً اب ایسے لوگ کہاں ملیں گے!! حکیم صاحب سے میری آخری ملاقات ان کے گھر پر ہوئی جب ان کی بینائی بالکل جواب دے چکی تھی، مگر ہوش وحواس کام کر رہے تھے۔ میں اپنی والدہ کا علاج کرانے گیا تھا۔ وہ بستر پر دراز تھے، رجسٹر ان کے بستر پر کھلا رکھا تھا اور قلم بھی، والدہ کی نبض دیکھی اور دوا لکھ دی۔ ان کے مطب سے جا کر قیمتاً دوا لے لی۔ اللہ نے ان کے ہاتھ سے ایسی شفا دی کہ پہلی ہی خوراک میں والدہ کو خاصا اثر ہو گیا، اللھم اغفر لہ۔ میں نے دیکھا کہ بہار سے ایک مریض آیا تھا، اس سے اس کا نام پوچھا تو باقی ساری تفصیلات وہ خود بتاتے گئے، اور مریض ہاں ہاں کرتا رہا، اللہ اکبر!

حکیم صاحب کے علاوہ ڈاکٹر خلیل صاحب جامعہ کے قدیم محسنوں میں ہیں جو کئی بار ناظم جامعہ رہے اور سر دو گرم ہر قسم کے حالات میں جامعہ کا تعاون کرتے رہے۔ ہم ایک ایک نام گنانے کے بجائے مختصراً یہ عرض کرنا چاہتے تھے کہ جامعہ کے لیے قصبہ بلریا گنج اور اطراف کے مسلمان صحیح معنوں میں بڑے مخلص ومہربان تھے اور ان کا دست تعاون ہمیشہ دراز رہتا تھا۔ طلبہ کے پروگراموں میں بھاری تعداد میں جب مرد وخواتین کی شرکت ہوتی تھی تو اس سے ان کی جامعہ سے دلچسپی اور محبت کا اندازہ ہوتا تھا۔

ہمارا مستقبل کا خواب یہ تھا کہ آگے چل کر یہ ایک معیاری اور مثالی دانش گاہ ہوگی، جس کا خواب تحریک اسلامی کے معماروں نے دیکھا تھا۔ لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ تحریکی اداروں کے لیے ہم اسے ماڈل نہیں بنا سکے۔ طلبہ کا معیار تعلیم بلند نہیں ہو سکا۔ نصاب تعلیم کی اصلاح کی فکر تو مسلسل کی جاتی رہی لیکن تبدیل شدہ نصاب کے مطابق خاکے میں رنگ بھرنے کا کام نہیں ہو سکا۔

جامعۃ الفلاح کا جو مثبت اور امتیازی پہلو سامنے آیا ہے وہ یہاں کا توسع، اعتدال پسندی اور فکری توازن ہے، چنانچہ جامعہ اور فارغین جامعہ نے ملک اور بیرون ملک اس پیغام کو عام کیا ہے، یہ جامعہ کا پہلا امتیازی پہلو ہے۔ اس کا دوسرا امتیازی پہلو اس کا نصاب ہے، خواب اچھا ہے مگر رنگ بھرنا اور ویسی چمک لانا باقی ہے جیسی کہ مطلوب ہے۔ ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے، سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں لیے۔

ہجرت رسولؐ اور خانوادۂ صدیقؓ

جوھر جاوید، موبائیل نمبر: 08409640946

دین الٰہی اسلام اور اس کی تاریخ کا مطالعہ جن حضرات کی دلچسپیوں سے خالی ہے انہیں شاید یہ محسوس ہوتا ہو کہ دین اسلام بھی دیگر مذاہب عالم میں سے ایک مذہب ہے اور اس کی توسیع وتبلیغ بھی ویسے ہی عمل پذیر ہوئی ہوگی جیسی کہ دیگر مذاہب کی تاریخ ہے مگر اسلام کے باب میں واقعہ اس سے مختلف ہے۔

اسلام کی توسیع وتبلیغ میں الٰہی ہدایات، اس کے دستور اساسی قرآن کی قوت تسخیر، نبی اکرمؐ کی ذات مقدس جو ہر اعتبار سے کامل بھی تھی اور اپنے اندر بلا کی کشش بھی رکھتی تھی۔ آپ کا پاکیزہ اخلاق، نبوت سے قبل بے داغ زندگی، صحابہ کرام کی بے مثال اور ناقابل فراموش قربانیاں اس مراحل کی مسلسل کڑیاں ہیں۔

اس مختصر مضمون میں دعوت اسلامی کے جس مخصوص مرحلے کا مطالعہ پیش نظر ہے وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت الی المدینہ اور اس مبارک سفر میں خانوادہ صدیق کی بے مثال قربانیاں ہیں۔

تاریخ وسیر اور احادیث کی تمام کتابوں میں یہ واقعہ آج اپنے پورے خدوخال اور ہر چھوٹی بڑی تفصیلات کے ساتھ موجود ہے، دن اور تاریخ کے تعین کے ساتھ مؤرخین نے بہت احتیاط کے ساتھ اس واقعہ کو محفوظ کیا ہے، قرآن کریم میں بھی اس کے بعض اہم مراحل کا تذکرہ ملتا ہے۔

اس واقعہ کی اسلامی تاریخ میں اس لئے اہمیت بہت زیادہ ہے کہ یہ وہ سفر ہجرت ہے جس نے بعد کو عالم انسانی کی تاریخ کو بدل ڈالا۔ اس کے علاوہ اس واقعہ کی معنویت پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ واقعہ ہجرت محض نقل مکانی نہ تھی جبکہ فی الواقع دعوت اسلامی کے فروغ، ارتقاء اور استحکام اور مستقبل کے منصوبوں کو مکمل طور پر عملی صورت دینے کے پہلو سے سنگلاخ سرزمین سے ایک زرخیز سرزمین کی طرف ہجرت تھی، ناقدروں اور سنگدلوں کے درمیان سے قدردانوں، ہمدردوں اور دردمندوں کی طرف روانگی تھی۔ اپنوں کے جور وستم سے نجات اور غیروں کی فقید المثال مہمان نوازی اور ایثار وقربانی کی تاریخ سے عالم انسانیت کو متعارف کرانے کا موقع تھا، اور سب سے بڑھ کر دعوت اسلامی کی تقویت، استحکام اور اس کے جملہ جوانب کے عملی ظہور کے لیے تخم کی حیثیت رکھتی ہے۔ ورنہ جب تک اسلام مکہ میں تھا اور وہاں جس طرح قدم بہ قدم رکاوٹیں اور سختیاں تھیں، ظاہر بیں نگاہیں مستقبل میں اس کے اس قدر برگ وبار

لانے کی توقع نہیں کرسکتی تھیں۔

واقعہ کی مکمل تفصیلات کا یہ چھوٹا سا مضمون متحمل نہیں ہوسکتا، مزید یہ کہ قارئین کے ذہن میں سفر ہجرت کی تفصیلات کا ایک بھرپور نقشہ موجود بھی ہوگا۔ لہٰذا واقعہ ہجرت میں سے صرف ان امور کو فوکس کیا جائے گا جن میں ہمارے لئے دعوتی اسباق ہیں اوران کے توسط سے واقعہ کی کچھ تفصیلات بھی آجائیں گی۔

یوں تو سفر ہجرت میں ہمیں متعدد اہم کردار نظر آتے ہیں مگر ان میں سب سے زیادہ اہم کردار جن حضرات کا ہے وہ سیدنا ابوبکرؓ اوران کا خاندان ہے۔ آپ کا پورا کنبہ نبی اکرم کی مدد اور حمایت کے لیے ہمہ تن وقف تھا۔ حضرت صدیقؓ نے حضور اکرمؐ سے جب یہ اشارہ پایا کہ آپؐ کو ہجرت کے اس مبارک سفر میں نبی اکرمؐ کی معیت کے شرف سے ممتاز ہونے کا موقع ملے گا تو آپ کی آنکھیں فرط مسرت سے چھلک اٹھیں۔ حضرت عائشہؓ کا بیان ہے:''فو الله ما شعرت قط قبل ذلك اليوم ان أحداً يبكى من الفرح، حتى رأيت أبا بكر يبكى يومئذ''۔ (ابن ہشام)

سفر ہجرت میں نبی اکرم کی معیت کا اشارہ ملتے ہی آپ نے اس کی تیاریوں کا آغاز کرلیا تھا۔ سب سے پہلے آپؓ نے اپنی ملکیت میں سے دو عمدہ قسم کی اونٹنیوں کا انتخاب کیا، بڑے جتن سے انہیں ۴/ماہ تک ببول کے پتے کھلا کر تیار کیا کہ وہ اس مبارک سفر میں آپ کے کام آسکیں۔

وہ شب جس میں اس عظیم الشان سفر کی ابتداء ہوئی، روایات بتاتی ہیں کہ سیدنا صدیق کا پورا گھر اس کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ دونوں بیٹیاں حضرت صدیقہؓ اور حضرت اسماءؓ رسول اللہؐ کے لیے زادراہ کی تیاریوں میں مشغول تھیں، مختلف قسم کی کھانے کی اشیاء تیار کر کے آپؐ کے ہمراہ روانہ کیں۔

غارثور میں روپوشی کے ایام میں سیدنا صدیق کے صاحبزادے سے رات آپؐ اور ابوبکرؓ کے ساتھ غارثور میں ہی بسر کرتے۔ صبح نمودار ہونے سے قبل گھر لوٹ آتے۔ قریش کی ہر نقل وحرکت پر نظر رکھتے اور شام ہوتے ہی دوبارہ غارثور میں حاضر ہوکر دن بھر کی رپورٹ پہنچادیتے۔ یہ فرض حضرت عبداللہؓ کے ذمہ تھا۔ غارثور میں روپوشی کے ایام میں آپؓ نے اپنا یہ فرض نہایت احتیاط اور حد درجہ خوبی وفراست کے ساتھ انجام دیا۔

عامر بن فہیرہ حضرت ابوبکرؓ کے غلام کے سپرد یہ ذمہ داری تھی کہ وہ حضرت ابوبکرؓ کی بکریاں چراتے ہوئے روزانہ شام کو غارثور کے پاس پہنچ جایا کریں تاکہ رسول اللہؐ کے لیے کچھ تازہ دودھ کا انتظام ہوجایا کرے۔ روپوشی کے تینوں دنوں میں انہوں نے ایسا ہی کیا۔

بعض روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت اسماءؓ روزانہ رات میں کھانا بنا کر پہنچا آتی تھیں۔ جس کے ذمہ جو ذمہ داری اور فرض سونپا گیا تھا اسے وہ بحسن وخوبی انجام دے رہا تھا اور شدید احساس ذمہ داری کے ساتھ انجام دے رہا تھا۔

حضرت اسماءؓ نے اس واقعہ ہجرت میں زبردست ہوش مندی اور فراست کا ثبوت دیا۔ دو واقعات سے آپؓ کی ذہانت اور اسلام کے تئیں آپ کے قلبی جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ پہلا واقعہ اس وقت کا ہے جب قریش نبی اکرم کو بستر پر نہ پا کر تلملا اٹھتے ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ کے گھر پر چھاپہ مارتے ہیں۔ دستک دینے پر حضرت اسماءؓ نکلتی ہیں۔ ابوجہل پوچھتا ہے تیرا باپ کہاں ہے؟ جواب دیتی ہیں ''واللّٰہ لا أدری این أبی؟ اس پر وہ سنگ دل اس کم عمر بچی کو اس زور کا طمانچہ مارتا ہے کہ کانوں سے بالی ٹوٹ کر گر جاتی ہے۔ حضرت اسماءؓ اس کی روداد بیان کرتے ہوئے کہتی ہیں ''فلطم خدی لطمة طرح منها قرطی''۔ (ابن ہشام)

ہجرت کے وقت سیدنا ابوبکرؓ کے والد بقید حیات تھے۔ درازی عمر کے باعث بینائی چلی گئی تھی۔ انہیں جب یہ معلوم ہوا کہ سیدنا ابوبکرؓ اپنے تمام مال (اس وقت ان کے پاس پانچ یا چھ ہزار دراہم تھے) کے ساتھ حضور کے ساتھ مدینہ ہجرت کر گئے ہیں تو ان کو اپنے پوتے اور پوتیوں کے متعلق بڑی فکر لاحق ہوئی، کہنے لگے: ''والله انی لأراه قد فجعكم بماله مع نفسه''۔ (ابن ہشام)

اس پر حضرت اسماءؓ نے ایک طاق میں پتھر کے چند ٹکڑے جمع کئے پھر اپنے دادا کا ہاتھ پکڑ کر اس پر رکھا اور کہا: ''دیکھئے ہمارے لئے ابو نے کتنا کچھ چھوڑا ہے''۔ دادا مطمئن ہو گئے۔ کہا اگر ایسا ہے تو ٹھیک ہے۔

مدینہ کی طرف قافلہ نبوی (جس میں نبی اکرمؐ، حضرت ابوبکرؓ، عامر بن فہیرہ اور عبداللہ بن اریقط شامل ہیں) رواں دواں ہے۔ مکہ کے چھوٹنے کی دل میں کسک ہے، دل مغموم ہے، قریش کی ریشہ دوانیوں پر حسرت ہے، سفر لمبا ہے، بے آب و گیاہ سرزمین ہے، نہ اعوان نہ انصار، خدا کی کارسازی دیکھئے غار ثور سے نکلنے کے بعد راستہ میں اچانک حضرت زبیر سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ یہ کون ہیں؟ حضرت اسماء بنت ابی بکر کے شوہر۔ وہ شام کے تجارتی سفر سے لوٹ رہے تھے، انہوں نے آپؐ اور ابوبکرؓ کو چند قیمتی کپڑے پیش کئے، بات بہت معمولی سی معلوم ہوتی ہے مگر سفر کا پس منظر معلوم ہو تو اس کا صحیح تر اندازہ ہوگا کہ یہ کتنی بڑی بات تھی۔ سفر اور وہ بھی اس طرح کا جس میں ہر دم کسی دشمن کے تعاقب کا کھٹکا لگا ہوا ہو، سر اور جان پر بڑے انعام کا اعلان ہو چکا ہو، وہاں کوئی ہمدرد اور شناسا مل جائے تو کتنی ہمت بندھی ہوگی، کتنی تقویت ملی ہوگی۔

سیدنا ابوبکرؓ کا خاندان رسول اللہؐ کی محبت میں سرشار دین الٰہی کی نصرت و مدد کے لیے ہر آن کوشاں صبغۃ اللہ کا کیسا حسین منظر پیش کر رہا ہے، اتنے پر خطر اور نازک وقت میں جبکہ قریش آپ کی جان لینے کے درپے تھے۔ مکہ میں معدودے چند مسلمانوں کے کوئی بھی نہ تھا۔ حضرت ابوبکر اور ان کے گھر والوں کا آپؐ کی حمایت کے لیے آگے آنا اور اس طرح کی قربانیاں پیش کرنا زریں الفاظ میں لکھے جانے کے قابل غیر معمولی واقعہ ہے۔

محبت رسول کا یہ کس قدر حسین صدیقی نمونہ ہے۔ مکہ سے نکلنے کے بعد پیارے نبیؐ اور حضرت

ابوبکرؓ غار ثور کے دہانے پر کھڑے ہیں، حضرت ابوبکرؓ کہتے ہیں: اے اللہ کے رسول آپ باہر تشریف رکھیں میں غار کی صفائی کرآ تا ہوں۔ روایات پڑھ کر آنکھیں نم ہوجاتی ہیں کہ سیدنا صدیق غار ثور کے اندر جا کر پورے غار کی تلاشی لیتے ہیں، کونے کونے کو صاف کرتے ہیں ایک ایک بل کا منھ اپنی چادر پھاڑ پھاڑ کر بند کرتے ہیں اور جب مکمل طور پر اطمینان ہوجاتا ہے کہ اب نبی اکرمؐ کے لیے غار پوری طرح محفوظ ہے تو سرور کائنات سے غار میں آنے کی درخواست کرتے ہیں۔ بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ ایک بل کا منہ نہ بند کر سکے تو اپنے پیر سے اسے بند کیا۔ اپنی جان کی ذرا بھی پرواہ نہیں، اللہ کے رسولؐ کی ادنیٰ سی بھی تکلیف برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ کے حصے میں اللہ نے کیسی خوش نصیبی لکھی تھی۔

اپنے رہنما اور محسن کی جان سے کیسی محبت ہے یہ، آپؐ کی جان کی حفاظت کے لئے کیسی تڑپ ہے یہ، مکہ سے جب غار ثور کے لئے نکلتے ہیں تو کبھی آپ کے آگے چلتے ہیں تو کبھی پیچھے چلنے لگتے ہیں۔ نبی اکرمؐ اس کی وجہ دریافت کرتے ہیں تو کہتے ہیں: ''رسول اللہؐ جب مجھے لگتا ہے کہ دشمن آگے سے حملہ آور ہوسکتا ہے تو آگے چلتا ہوں اور جب محسوس ہوتا ہے کہ کہیں دشمن پیچھے سے حملہ نہ کردے تو پیچھے آجاتا ہوں۔'' سیدنا ابوبکرؓ کو نبی اکرمؐ اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز تھے۔ واقعی سیدنا ابوبکرؓ نے محمدؐ سے وفا کا حق ادا کرنے کی ایک لازوال مثال ہیں۔

حضرت اسماءؓ نے واقعہ ہجرت میں ایسا حسین کردار پیش کیا کہ قیامت تک کے لئے ذات النطاقین کے لقب سے ملقب ہوئیں۔

دعوت اسلامی کے لئے قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی یہی بے مثال قربانیاں تھیں جن کی وجہ سے محض 23 سال کی قلیل مدت میں اس دھرتی کا سب سے عظیم الشان انقلاب رونما ہوا۔ اور صرف جزیرۃ العرب ہی نہیں بلکہ دنیا کے ایک بڑے حصے کی دیکھتے ہی دیکھتے کایا پلٹ گئی۔ یہ انقلاب محض سیاسی نہ تھا بلکہ فی الواقع انسان کی سوچ اور اس کے رویہ کا انقلاب تھا۔ اس کے اخلاق و کردار کا انقلاب تھا۔ اسلامی تاریخ کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرمؐ کے ساتھیوں میں سے ہر ایک نے مختلف مراحل اور محاذ پر جو جانی و مالی قربانیاں پیش کیں وہ قربانی کی معراج ہیں، اس سے آگے انسانی ذہن تصور بھی نہیں کرسکتا۔ کسی بھی تحریک یا دعوت کی کامیابی کے لئے بے پناہ قربانیاں درکار ہوتی ہیں۔ گھر کے صرف ایک فرد کی نہیں بلکہ جس سے جو بن پڑے اسے اپنی خدمات احساس ذمہ داری کے ساتھ پیش کرنی چاہئیں۔ دعوت دین کے مثبت اثرات سماج پر تبھی دیکھے جاسکتے ہیں جب تحریکی افراد کے گھر کا پورا ماحول سپورٹیو ہو۔ بیوی، اولاد، غلام، نوکر سب ایک مقصد اور ایک نصب العین کے حصول کے لئے ہمہ تن وقف اور قائد کی ہر ممکن مدد و نصرت کے لئے ہمہ تن تیار، بالکل اسی طرح جیسے واقعہ ہجرت میں سیدنا ابوبکرؓ کا خاندان اسلام کی مدد کے لئے ہر طرح کی جانی و مالی قربانی پیش کرتے نظر آتا ہے۔ اللھم انصر من نصر دین محمدؐ واجعلنا منھم۔ ●◻●

بچوں کی تربیت

کے لیے مطلوبہ لٹریچر: صورتحال اور امکانات

- بچوں کی تربیت کی کیا اہمیت ہے، اسلامی اقدار اور اسلامی تعلیمات کے حوالے سے۔
- بچوں کا لٹریچر یا ادب اطفال کسے کہتے ہیں؟
- ادب اطفال کی موجودہ صورتحال کیا ہے، بالخصوص اسلامی ادب یا تعمیری ادب کے تناظر میں؟
- موجودہ ترقی یافتہ دنیا میں ادب اطفال کا دائرہ کہاں تک وسیع کیا جاسکتا ہے؟
- کیا ویژول دنیا میں بچوں کو اچھا مواد فراہم کرنا وقت کی ضرورت اور تعمیری ادب اطفال یا اسلامی ادب اطفال کی ناگزیر ضرورت نہیں ہے؟
- ادب اطفال کی موجودہ صورتحال کے تناظر میں کیا کچھ اقدامات مطلوب ہیں؟

یہ اور اس طرح کے متعدد سوالات ہیں جو ''بچوں کی تربیت کے لیے مطلوبہ لٹریچر: صورتحال اور امکانات'' سے متعلق سامنے آتے ہیں۔ ذیل کی سطور میں ان سوالات پر اچھی اور مفید گفتگو کی گئی ہے، امید کی جاتی ہے کہ اس سے ہمارے درمیان ایک سنجیدہ علمی بحث کا آغاز ہوگا۔ (مدیر)

تنویر آفاقی فلاحی، ابوالفضل انکلیو، اوکھلا، نئی دہلی۔ موبائیل نمبر: 9811912549

بچوں کی تربیت اس دور کا بہت بڑا اور اہم مسئلہ ہے۔ امت کے اندر جہاں بہت سی خرابیاں پائی جاتی ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ بچوں کی خاطر خواہ تربیت کی طرف سے بالکل غفلت برتی جارہی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر آنے والی نسل اسلام کی تعلیمات سے زیادہ سے زیادہ دور ہوتی جارہی ہے۔ اسلام نے بچوں کی تربیت پر خاص توجہ دی ہے۔ بچے کے اندر معمولی شعور پیدا ہوتے ہی، یعنی سات سے دس برس کی عمر میں ہی یہ تاکید کی گئی ہے کہ ان کی دینی تربیت پر خصوصی توجہ دی جائے اور ضرورت ہوتو، ہلکی پھلکی سزا سے بھی گریز نہ کیا جائے۔

بچوں کی تربیت کا ایک بہترین ذریعہ ایسا لٹریچر ہوسکتا ہے، جو ان کی عمر، مزاج اور دلچسپی کو سامنے رکھ کر تیار کیا گیا ہو۔ اس سلسلے میں اگر چہ ماضی میں کچھ کوششیں بھی کی گئی تھیں، لیکن اس میں حالات کے اعتبار سے کوئی نیا ارتقاء نہیں ہوسکا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بڑے کیا، بچوں میں بھی پڑھنے کا رجحان کم، بلکہ برائے نام ہی رہ گیا ہے۔ اس کی ایک وجہ پرنٹ کے مقابلے میں ویژول میڈیا کی ترقی ہے، تو دوسری وجہ یہ کہ بچوں کے لیے جو لٹریچر تیار کیا جاتا ہے اس کا انداز پیشکش آج بھی وہی ہے جو الکٹرانکس میدان میں آنے والی ترقی سے پہلے تھا۔ اگر لٹریچر اچھے معیار کے ساتھ اس طرح پیش کیا جائے جو بچوں کو نئے الکٹرانکس ڈوائس کا متبادل محسوس ہونے لگے تو بچے کتابوں کی طرف لازماً راغب ہوں گے۔ انگریزی اور دوسری زبانوں میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔ ان زبانوں میں بچوں کے لیے رنگین تصاویر اور مختلف رنگوں سے مزین لٹریچر تیار کیا جاتا ہے اور بچے انہیں پڑھتے بھی ہیں۔ افسوس کہ اردو میں اس کے لیے کوئی کوشش نہیں کی جاتی۔ ادھر ایک دو ادارے مثلاً 'گڈ ورڈس' وغیرہ ایسے وجود میں آئے ہیں جو بچوں کے لیے موجودہ دور کی ضرورتوں سے ہم آہنگ ہو کر لٹریچر تیار کرتے ہیں۔ لیکن ان کی یہ کوشش صرف انگریزی تک ہی محدود ہے۔ حالانکہ یہ کوشش اردو زبان میں بھی ہونی چاہئے۔

اس ضمن میں یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ اب مسلمان بچوں میں بھی اردو کا ذوق وشوق بہت کم ہوگیا ہے، اس لیے اردو میں اس قسم کا تجربہ کرنا خسارے کا سبب ہوسکتا ہے۔ یہ بات درست ہوسکتی ہے۔ اس سلسلے میں والدین کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ اپنے بچوں کے اندر اردو کا ذوق اور دلچسپی پیدا کریں۔ والدین کے سامنے اچھے معیار کے ساتھ اردو لٹریچر آئے گا تو ان شاء اللہ ان کے اندر اس کی طرف بچوں کو راغب کرنے کا شوق بھی پیدا ہوگا۔

بچوں کو الیکٹرانک میڈیا کے اثرات بد سے محفوظ رکھنے کے لیے بھی یہ ضروری ہے کہ انہیں مطالعے کا خوگر بنایا جائے۔ ان کے لیے جس طرح ٹی وی، کارٹون وغیرہ دیکھنے کے لیے وقت مختص کیا جاتا ہے، اسی طرح

کچھ وقت کتابوں کا مطالعہ کرنے کے لیے بھی مختص کیا جائے اور اس سلسلے میں ان کی پوری مدد کی جائے۔

سعید اختر اعظمی (فلاحی)، معلم دارۃ السلام انٹرنیشنل دہلی پبلک اسکول، ریاض، سعودی عرب

ادب اطفال یعنی وہ منثور و منظوم تحریریں جنہیں بچوں کی نفسیات کو پیش نظر رکھتے ہوئے لکھا جا رہا ہے۔ یہ کتنا مفید یا مضر ہے اس ضمن میں یہ سوال یقیناً کافی اہم ہے۔ اس سوال کا جواب قلم کاروں کی اُن تحریروں کے توسط سے سامنے آجاتا ہے جو کتابوں اور رسائل و جرائد کے صفحات پر بکھری ہوئی ہیں۔ ان میں سے بعض میں مقصدیت کارفرما ہے تو بعض میں صرف وقتی تفریح کو ہی حرف آخر مان لیا گیا ہے۔ کہانی ہو یا نظم یا کوئی معلوماتی مضمون اسے بچوں کے سامنے لاتے ہوئے ادیب اطفال کو یہ سوچنا ہے کہ عہد حاضر میں کیا اس کو معصوم ذہنوں تک رسائی کی واقعی ضرورت ہے؟

نصابی کتب میں نثر و نظم کے حوالے سے جو کچھ طالب علموں کے سامنے پیش کیا جاتا ہے ٹسٹ اور امتحان کی تیاری کے دوران اعادہ کرتے ہوئے اس کی تکرار ناگزیر ہو جاتی ہے۔ ایسے میں بچوں کو دادی نانی کی زبانی، ٹی وی پر کارٹون اور غیر درسی کتب کا سہارا لے کر ایک خوابناک فضا میں گم کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہتا۔ ان میں بالعموم شاعری کا حصہ کم ہوتا ہے اور کہانیوں کا زیادہ۔ نوعمری میں شاعری بھلے ہی ابتدا میں سمجھ میں نہ آئے لیکن اس کے اثرات دیرپا ہوتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں دیومالائی، جنوں، پریوں، بھوتوں کی کہانیاں نفسیاتی سطح پر کمزور بناتی ہیں۔ پنچ تنتر اور کلیلہ دمنہ کی کہانیاں اگرچہ انسانوں کی نہیں ہیں پھر بھی جانوروں اور پرندوں کے توسط سے جو سبق دیا گیا ہے اس سے اِن کہانیوں میں مقصدیت کا پہلو نمایاں ہو جاتا ہے۔

ادب اطفال کے میدان میں کچھ کر دکھانے کا جذبہ ابتدا سے ہی قلم کاروں میں رہا ہے۔ اردو میں ناول کے اولین نقوش ثبت کرنے والے ڈپٹی نذیر احمد نے مرأۃ العروس میں دو لڑکیوں اکبری، اصغری کے مختلف مزاج کی عکاسی کی ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اصلاح خانہ کے لیے نوعمری میں ہی تربیت دینی چاہئے۔ یہ ناول ادب اطفال کے زمرے میں بھلے ہی نہ رکھا جائے، اُس مقصد کی تکمیل میں معاون ہے جو کہانیوں کو سنا کر یا کتابی صورت میں لا کر حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اسماعیل میرٹھی، کوثر اعظمی، شفیع الدین نیر، ذاکر حسین، مرزا ادیب، مائل خیر آبادی، متین طارق باغپتی، محمود عالم وغیرہ نے بچوں کی تشکیلی بنیادوں اور ان کی نفسیات کو سامنے رکھ کر جو کچھ لکھا ہے اسے کامیاب ادب اطفال قرار دیا جا سکتا ہے۔

انگریزی اور ہندی میں جتنا کچھ بچوں کے لیے لکھا جا رہا ہے اردو میں شائد اس کا پچاس فیصد بھی

نہیں ہے۔ اردو میں جو کتب اور رسائل وجرائد بچوں کے لیے وقف ہیں یا تو وہ بچوں تک رسائی حاصل کرنے میں ناکام ہیں یا پھر اُن کی قیمتیں اتنی زیادہ ہیں کہ سرپرست اسے پابندی سے خرید نہیں سکتے۔ قومی زبان ہونے کی وجہ سے پاکستان میں ادب اطفال کتابوں اور جریدوں کے توسط سے بچوں تک بخوبی پہنچ رہا ہے اور اس کی پذیرائی بھی ہورہی ہے جبکہ ہندوستان میں ہندی وانگریزی کی توسیع کے سبب اردو کتب کی ترسیل خاطر خواہ نہیں ہو پاتی۔

تنوع نہ ہونے اور یکسانیت کا شکار ہونے کی وجہ سے ہندوستانی ادب اطفال زوال کا شکار ہے۔ ادیب اطفال اپنی تحریروں میں دلچسپی لانے اور نئی نسل کے ذہنوں تک اپنی بات پہنچانے کے لیے مسلسل کوشاں ہیں۔ سست روی سے ہی سہی اردو حلقہ تک ترسیل خیالات ہورہی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ کارٹون، اسکیچ، تصاویر، اور رنگوں کا سہارا لے کر کتابوں اور رسائل وجرائد کو خوبصورت بنایا جائے تاکہ نوعمر بچوں کی دلچسپی کا بھرپور سامان ہوسکے۔ صرف حروف اور الفاظ سے ان کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانا آسان نہیں۔ یہ بچوں کی دلچسپی ہی ہے کہ ٹی وی کے کارٹون مکی ماؤس، ٹام اینڈ جیری وغیرہ انہیں جتنا متأثر کررہے ہیں اتنا صفحات پہ بکھری ہوئی تحریریں اثر نہیں ڈالتیں۔

کم قیمت پر کتب کی دستیابی اور نصابی کتابوں کے ساتھ خارجی مطالعہ کی عادت ادب اطفال کے فروغ میں معاون ہوگی۔ اسی طرح انہیں صالح لٹریچر مہیا کرایا جائے جس میں انبیاء وصلحاء، مجاہدین صحابہ کرام، جرنیلوں اور کوہ گراں سر کرنے والوں کی داستانیں ہوں۔ یہ پیش قدمی یقینی طور پر مفید ثابت ہوگی۔

خبیب کاظمی (فلاحی)، دوحہ، قطر۔ ای میل:khfalahi@yahoo.com

بچے قوم کا قیمتی سرمایہ ہوتے ہیں کیونکہ بڑے ہوکر وہی مستقبل کے معمار ہوتے ہیں۔ بچہ کی اولین درسگاہ ماں کی گود ہوتی ہے۔ بچے کے لیے اس کا باپ ہی اس کے سامنے پہلا آئیڈیل ہوتا ہے۔ بھائی بہنوں اور ماں باپ پر مشتمل گھر ہی اس کی کل دنیا ہوتی ہے، اس کی شخصیت پر اپنے گھر کا ماحول بہت اثر انداز ہوتا ہے۔ بچوں کے لیے صالح لٹریچر سے زیادہ گھر کا صالح اور شفاف ماحول ہونا بہت ضروری ہے۔ بچوں کی اچھی تعلیم وتربیت اور صالح معاشرہ فراہم کرنا والدین کی ذمہ داری اور بچوں کا بنیادی حق ہے۔ قرآن پاک کے کئی مقامات پر ہمیں اس بات کا حکم ملتا ہے، سورہ تحریم کی آیت قُوا أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَاراً کے ضمن میں متعدد مفسرین یہی لکھتے ہیں کہ ''اپنے اہل وعیال کی اچھی تعلیم وتربیت کرو''۔ مستدرک حاکم میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تفسیر اسی طرح ہے ''علموا انفسکم واھلیکم الخیر وادبوھم ''۔ امام رازی اور مقاتل بن سلیمان اپنی تفسیر میں تھوڑے فرق سے لکھتے ہیں: ''قوا انفسکم ای: بالانتھاء عما نھاکم اللہ عنہ''،

"أن يؤدب المسلم نفسه و اهله، فيأمرهم بالخير، وينهاهم عن الشر"۔ صاحب کشاف کہتے ہیں: ''ترک معاصی اور اطاعت امر کے ذریعہ بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو اس آگ سے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے''۔ مولانا مودودی علیہ الرحمہ لکھتے ہیں: ''پتہ چلا کہ ایک شخص کی ذمہ داری صرف اپنی ذات تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ اللہ نے جس خاندان کی سربراہی اس کے ذمہ کی ہے وہ ان کو ایسی تعلیم وتربیت دے جس سے وہ خدا کے پسندیدہ انسان بنیں''۔ (تفہیم القرآن)

اس بات کو بھی ہمیشہ ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ کل ان اہل وعیال کے بارے میں ہماری باز پرس ہوگی۔ رسول اللہؐ نے فرمایا: ''تم میں سے ہر شخص محافظ اور ذمہ دار ہے، اور ہر شخص سے اس کی رعیت (جو کوئی اور جو کچھ اس کی ذمہ داری میں ہے) کے متعلق پوچھا جائے گا۔ پس امیر، جو لوگوں کا محافظ ہے، اس سے ان کے متعلق پوچھا جائے گا۔ مرد اپنے گھر والوں کا محافظ ہے، اس سے ان کے متعلق پوچھا جائے گا۔ عورت اپنے شوہر کے گھر اور اس کے بچوں پر محافظ ہے اس سے ان کے متعلق پوچھا جائے گا''۔

سورہ انعام کی ۱۵۱ رنمبر کی آیت وَلَا تَقْتُلُوْا أَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ إِمْلَاقٍ کی تشریح کرتے ہوئے مفتی محمد شفیع صاحبؒ اپنی تفسیر معارف القرآن میں لکھتے ہیں کہ ''اولاد کی تعلیمی اخلاقی تربیت نہ کرنا اور بے دینی کے لیے آزاد چھوڑ دینا بھی ایک طرح سے قتل اولاد ہے......قرآن کریم نے اس شخص کو مردہ قرار دیا ہے جو اللہ کو نہ پہچانے اور اس کی اطاعت نہ کرے، آیت (أَوَ مَنْ كَانَ مَيْتًا فَأَحْيَيْنَاهُ۔۔ الخ،) میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے......ظاہری قتل کا اثر تو صرف دنیا کی چندروزہ زندگی پر پڑتا ہے، مگر یہ قتل انسان کی اخروی اور دائمی زندگی کو تباہ کر دیتا ہے''۔

معلوم ہوا کہ بچوں کی اچھی تربیت کرنا ان کا اولین حق ہے۔ دیگر افرادِ معاشرہ کی طرح بچوں کا بھی ایک اخلاقی مقام اور معاشرتی درجہ ہے بلکہ اسلام نے بچوں کے حقوق کا آغاز ان کی پیدائش سے بھی پہلے کیا ہے۔ ان حقوق میں حق زندگی، حق وراثت، وصیت، اور نفقہ جیسے حقوق شامل ہیں۔ قربان جائیے نظام اسلامی پر جہاں بچوں کے حقوق کی ضمانت ان کی پیدائش سے پہلے ہی فراہم کردی جاتی ہے۔ دنیا کے کسی نظام قانون میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ بچوں کے حقوق میں ایک بنیادی حق یہ بھی ہے کہ اس کے لیے ایسی صالح ماں کا انتخاب کیا جائے جو اس کے نطفے کو بطور امانت رکھ سکے۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اپنے بچوں کے لئے اچھی عورت کا انتخاب کرو کیونکہ عورتیں اپنے بہن بھائیوں جیسی اولاد پیدا کرتی ہیں''۔ (تَخَيَّرُوْا لِنُطُفِكُمْ فَإِنَّ النِّسَاءَ يَلِدْنَ أَشْبَاهَ إِخْوَانِهِنَّ وَأَخَوَاتِهِنَّ) دوسری جگہ ارشاد فرمایا: ''اپنے نطفوں کے لئے صالح عورتوں کا انتخاب کرو اور مناسبت والوں میں رشتہ کرو'' (تَخَيَّرُوْا لِنُطُفِكُمْ وَأَنْكِحُوْا الْأَكْفَاءَ۔ سنن ابن ماجہ) نیک، اور خاندانی عورت کا انتخاب بچے کی درست پرداخت اور اس کی صحیح تربیت کے لیے بہت ضروری ہے۔ قرآن پاک میں حضرت نوح علیہ

السلام کی بیوی کی مثال موجود ہے جس نے کفر کو ایمان پر ترجیح دی اور اپنے بیٹے پر برا اثر ڈالا، چنانچہ ماں کے ساتھ اس کا بیٹا بھی تباہی کا حصہ بن گیا۔ دوسری طرف فرزند ابراہیم حضرت اسماعیلؑ کا کردار دیکھ لیجئے، چونکہ حضرت اسماعیلؑ کی والدہ ایک نیک اور مومنہ خاتون تھیں اور یہ ماں کی تربیت کا اثر تھا کہ حضرت اسماعیل تسلیم و رضا اور عشق الٰہی کے عملی پیکر بن گئے۔

اس مختصر تمہید کے بعد اصل موضوع سے متعلق چند باتیں نذر قارئین کرنا چاہتا ہوں۔ ایسا لٹریچر جس سے بچے کی شخصیت میں نکھار بھی آئے اور اس میں اس کی دلچسپی کا سامان بھی ہو نایاب تو نہیں کمیاب ضرور ہے۔ کتابوں کی جگہ آج جدید ٹکنالوجیز نے لے لی ہے۔ موبائل، ویڈیو گیم، کارٹون نیٹ ورک نے آج بچوں کو کتابوں کی دنیا سے بہت دور کر دیا ہے۔ کارٹون چینلوں نے ہمارے بچوں کو اپنی تاریخ، اپنے اسلامی کلچر سے دور اور ہندو اور مغربی کلچر و تہذیب سے قریب کر دیا ہے۔ ٹی وی چینلوں پر اب ایسے ایسے کارٹون آنے لگے ہیں جو انٹرٹینمنٹ کے نام پر مسلم بچوں کے عقائد خراب کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ کارٹون دیکھنے کے بعد بچوں کی نفسیات پر منفی اثرات بہت تیزی سے مرتب ہوتے ہیں۔ کارٹون میں موجود کردار کو حقیقی تصور کرنے لگ جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چھوٹے چھوٹے بچے اونچائی سے کود جاتے ہیں اس خیال سے کہ شکتی مان ان کو بچانے آئے گا، یا اونچائی سے اس لیے کود پڑتے ہیں کہ اسپائڈر مین بھی کودا تھا، اور اس کو کچھ بھی نقصان نہیں ہوا تو مجھے کیسے ہو سکتا ہے۔ اپنے اسکول کا ہوم ورک پورا کرنے کے لیے بچے ڈورے مون کا گجیٹ تلاش کرنے لگتے ہیں۔ ایک بچے نے اپنے ہم جماعت کو مار دیا، بچے سے وجہ پوچھنے پر معصومانہ انداز میں جواب دیا کہ گزشتہ رات جیری نے ٹام کو اسی طرح مارا تھا۔ ایک گائے بے قابو ہو کر بھاگ رہی تھی جسے دیکھ کر ایک بچہ گائے کے سامنے بھیم کی نقل کرتے ہوئے ڈٹ گیا اور کہنے لگا "میں بھیم ہوں آ جاؤ"۔ اچھا ہوا اسی دوران کسی نے دیکھ لیا اور اس بچے کو گائے کے سامنے سے ہٹا لیا۔

اس کے علاوہ ان کارٹونوں کے ذریعہ بچوں کی پسند اور دلچسپی محدود ہوتی جا رہی ہے جو ایک مضر چیز ہے۔ آج کل بڑی تعداد میں بچے ڈورے مون کو پسند کرتے ہیں، بچوں کا کریز دیکھتے ہوئے مارکیٹ میں ڈورے مون یا اس کے کرداروں کی شکل میں مہنگے مہنگے کھلونے دستیاب ہیں۔ بچوں کے رجحان کو دیکھتے ہوئے اب تو بنیادی ضرورتوں کی چیزوں میں بھی ڈورے مون چھا چکا ہے۔ ڈورے مون والا اسکول بیگ، پنسل، کاپیاں، پانی کا تھرماس، ٹفن بکس، کلائی کی گھڑی، دیوار گھڑی، ڈورمیٹ، لیمپ اور نہ جانے کون کون سی اشیاء مارکیٹ میں والدین کی جیبوں میں ڈاکہ ڈالنے کے لیے موجود ہیں۔

جو بچے ویڈیو گیم اور کارٹون چینل کے عادی ہو گئے ہیں ان کو اس جنون سے فوری باہر نکالنا آسان کام نہیں ہے، اس کے لیے بہت حکمت اور سمجھداری کی ضرورت ہے۔ آج ضرورت ہے کہ بچوں کی تربیت نظریاتی طور سے کی جائے۔ کارٹون کے کردار خواہ کتنے ہی لبھانے والے ہوں بچوں کے لیے سب سے

بڑے ہیرو اس کے والدین ہی ہوتے ہیں۔ضرورت ہے مثبت سوچ اور مستقل جدوجہد کی۔میرے خیال میں ہر کارٹونی کہانی میں کچھ نہ کچھ مثبت اور تعمیری چیز ہوتی ہے کبھی کبھار آپ بھی ان بچوں کے ساتھ ٹی وی دیکھنے لگ جائیں۔آپ ان سے ڈورے مون کے گجیٹس کے بارے میں ڈسکس کیجیے اور بتلائیے کہ محنت سب سے بڑا گجیٹ ہے۔آپ بچوں کے ذہنوں میں یہ بٹھا دیجئے کہ ''نوبتا'' نے جب جب اپنے دوست ''ڈورے مون'' کے گجیٹ کے ذریعہ سے کوئی کام کیا ہے اس کا اختتام خراب ہی ہوا ہے۔اور جو کام اپنی محنت سے دقت برداشت کر کے کیا جاتا ہے اس میں پائیداری ہوتی ہے، اور اللہ بھی محنت کو پسند کرتا ہے۔ آپ بچوں کو بتائیں کہ ''سوزوکا'' اپنا ہوم ورک کس مستعدی سے کرتی ہے وہ اپنے ہوم ورک کے بیچ کبھی کسی چیز کو حائل نہیں ہونے دیتی۔ان کارٹونی کہانیوں کے ذریعہ آپ بچوں کے ذہن میں یہ بات بٹھائیے کہ ظالم کتنا ہی طاقتور ہو اور وقتی طور سے خواہ کتنا ہی غالب ہو جائے مگر بالآخر وہ اپنے انجام سے ضرور دوچار ہوتا ہے، ہمیشہ جیت سچائی کی ہوتی ہے۔یہ تو ہوئی بات لٹریچر کی اس قسم کی جو الیکٹرانک میڈیا یا کسی حد تک سوشل میڈیا کے ذریعہ ہمارے بچوں تک پہنچائی جارہی ہے۔

ہمارے روایتی لٹریچر کی جگہ ٹیلی ویژن اور ویڈیو گیم نے کیوں لے لی ہے اس پر بھی سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔جب ہم بچوں کے لٹریچر کی بات کرتے ہیں تو ہماری نظر چند مصنفین کی طرف جا کر ٹھہر جاتی ہے۔بچوں کے چچا میاں جناب مائل خیرآبادی مرحوم کے بعد بہت بڑا خلا واقع ہو گیا ہے۔ کچھ اور حضرات یا اداروں نے بھی بچوں کے لٹریچر پر کام کیا ہے مگر ایسا کوئی لٹریچر ہمارے بچوں کو نہیں مل پا رہا ہے جو ان کو ویڈیو گیم یا کارٹونی فلموں سے دور کر سکے۔بچوں کا ھلال ہو یا نور، اچھا ساتھی ہو یا امنگ، کوئی بھی مائل صاحب کا معیار نہ پا سکا۔چھوٹی بچیوں کے لیے مائل صاحب کی کتاب ''ہم ایسی بنیں'' یا ''بڑوں کی مائیں'' اسی طرح ''ہاتھیوں سے ٹکر''، ''بھولے بھیا''، ''نقلی شہزادہ''، ''سچے افسانے'' یا اقبال کے ایک شعر پر چار کتابیں ''پھول کی پتی، ہیرے کا جگر، مردِ ناداں، کلام نرم و نازک'' جس انداز سے لکھی ہیں وہ بے مثال ہیں۔مائل صاحب کے تمام لٹریچر کے ساتھ ساتھ ان چار کتابوں کو بھی بہت پذیرائی حاصل ہوئی۔ان کتابوں میں ''مردِ ناداں'' میں جو افسانوی رنگ ہے وہ انداز مائل صاحب کا ہی خاصہ ہے۔اگر مائل صاحب کی کتابوں کو پکچرائز کر کے بچوں کو فراہم کیا جائے تو شائد اور بھی مقبول ہوں۔اس طرح جو بچے ویڈیو اور کارٹون میں اپنے وقت کا بڑا حصہ ضائع کرتے ہیں ان کے سامنے اگر مائل صاحب کی یا دیگر مصنفین کی باتصویر کتابیں موجود ہوں تو مجھے لگتا ہے کسی حد تک کارٹون کی غیر حقیقی دنیا سے وہ باہر آسکیں گے۔

بچوں کو سمجھایا جائے کہ وہ ویڈیو اور کارٹون ضرور دیکھیں مگر یاد رکھیں، اس سے لکھنے پڑھنے کی صلاحیتیں نہیں ابھر پاتیں۔مکی ماؤس، ٹام اینڈ جیری، سوپر مین، اسپائڈر مین کو ویڈیو میں دیکھنے کے بجائے ان کی کامکس پڑھا کریں۔اس سے ان کے ذخیرہ الفاظ (Vocabulary) میں اضافہ ہوگا،

املا اور گرامر میں سدھار آئے گا، لکھنے پڑھنے کی صلاحیتوں میں اضافہ ہوگا اور بہت ممکن ہے آگے چل کر وہ بھی ایک اچھے قلمکار بن جائیں۔ اگر آپ یہ بات بچوں کو سمجھانے میں کامیاب گئے تو یقین جانئے آپ کے بچے اپنی نگاہ اور دل و دماغ کو محفوظ رکھ سکیں گے۔

بچوں کے لٹریچر کے ضمن میں ایک بہت اہم بات جسے عام طور پر ہم نظر انداز کر جاتے ہیں۔ اس کے سلسلے میں پروفیسر عقیل کے بلاگ سے لی گئی ایک تحریر کا خلاصہ پیش کر کے اپنی بات ختم کر دوں گا۔ مضمون نگار ہیں ڈاکٹر بشریٰ تسنیم (شارجہ)، لکھتی ہیں: ''آج سے کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے جب فارغ اوقات میں اور بالخصوص شام کے سائے پھیلتے ہی بچے آج کے برعکس ٹیلی ویزن، کیبل یا انٹرنیٹ سے دل بہلانے کے بجائے دادا دادی، نانا نانی کے پاس جمع ہو جاتے، اور ان سے پرستان کی پریوں اور کوہ قاف کی حیرت انگیز شہزادیوں کے بارے میں کہانیاں سنا کرتے تھے، جن کا اختتام ہمیشہ کسی اخلاقی قدر سے وابستہ ہوتا تھا۔ الف لیلیٰ، راجا رانی، ٹارزن، عمرو عیار، حاتم طائی کی کہانیاں بچوں کو کچھ نہ کچھ سبق دے کر ہی ختم ہوتی تھیں۔ اسی طرح تاریخِ اسلام کے سچے واقعات، صحابہ وصحابیات رضوان اللہ علیہم اجمعین کی روشن مثالیں دے کر بچوں کو نیک اور صالح فطرت سے قریب تر رکھا جاتا تھا۔ غرض، ہر گھر میں اپنی علمی استعداد کے مطابق اور ماحول کے پیش نظر بچوں سے ذہنی، قلبی اور جسمانی قرب و تعلق بزرگوں کے ساتھ قائم رہتا تھا۔ دین دار گھرانوں میں نماز، چھوٹی سورتیں، دعائیں یاد کروانا ان ہی بزرگ والدین کا کام ہوتا تھا۔ لیکن آج یہ سب کچھ ایک خواب بن چکا ہے۔ غربت، جہالت، بے شمار مصروفیات اور مشینی زندگی نے ہماری معاشرتی اور سماجی زندگی کے حسن کو گہنا دیا ہے۔ بزرگ والدین کی حکیمانہ باتیں اور دادی، نانی کی لوریاں پس پردہ چلی گئی ہیں۔ ٹی وی، انٹرنیٹ اور کیبل کی آمد نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی ہے۔''

''بزرگ والدین تنہائی کا شکار ہیں۔ بچوں کے والدین دن بھر گھر سے باہر رہنے کے بعد تھکے ہارے گھر کو لوٹتے ہیں تو وہ بھی انٹرنیٹ اور کیبل میں راحت کا سامان تلاش کرتے ہیں۔ بچوں پہ ہوم ورک، ٹیوشن، نصابی کتب کا بوجھ اس قدر زیادہ ہوتا ہے کہ وہ گھر کے افراد کے ساتھ مل جل کر بیٹھنے اور کچھ کہنے سننے کی حسرت دل میں لیے سو جاتے ہیں اور موجودہ دور کا المیہ ایک تلخ حقیقت بن کر سامنے آ رہا ہے کہ والدین اور اولاد میں خلیج تیزی سے وسیع ہوتی جارہی ہے۔'' بچوں کی تربیت میں گھر کے بزرگوں (دادا دادی اور نانا نانی) کا بڑا رول ہوتا ہے۔ اسلامی تہذیب میں یہ رشتے شجر سایہ دار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دادی یا نانی کی زبان سے سنی اخلاقی کہانیوں کا کوئی بدل نہیں ہوسکتا، یہ ایک ایسا لٹریچر ہے جو نہ صرف تا حیات آدمی کے ذہن میں نقش رہتا ہے بلکہ یہ آدمی کی شخصیت میں نکھار لاتا ہے اور اس کے اخلاقی معیار کو بلند رکھتا ہے۔ میرا خیال ہے اس نقطہ نظر سے بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اخلاقی کہانیوں پر مشتمل کچھ حضرات نے بچوں کے لیے فلمیں بنائی ہیں کچھ لوگ برابر اس پر کام کر رہے ہیں، یہ ایک بڑی خدمت ہے۔ اس سلسلہ کی کچھ فلمیں ''ریحان سیریز'' والوں نے بنائی

ہیں، اس کے علاوہ ''مورل وژن'' کی ویڈیوز بھی بڑی دلچسپ اور تخلیقی ہوتی ہیں، وہ بھی بچوں کے لیے مفید ثابت ہوسکتی ہیں۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں کامیاب اور صالح والدین بنا کر باز پرس سے بچالے۔ آمین

سالم سلیم (فلاحی)، نئی دہلی۔ موبائیل نمبر:9540601028

اس دنیا میں آتے ہی بچے کی حیثیت ایک جاندار گوشت کے ساتھ ساتھ گھر کے ایک متحرک کردار کی بھی ہوجاتی ہے، وہ روتا ہے اور ماں کی آغوش کی گرمی اسے سرد و گرم سے مانوس بناتی ہے۔ پھر بتدریج وہ زمانے و سماج میں موجود مختلف تجربوں سے خود کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ خوف، حیرت، خوشی، غم اور انسانیت کے معنی کھولنے کی کوشش میں بچے کا شعوری سفر جاری رہتا ہے۔ ادب بھی کم و بیش انہیں تجربات سے سروکار رکھتا ہے۔ بچوں کا ادب اور بڑوں کا ادب ایسی تخصیص تو ایک زمانہ سے دنیا کی بیشتر زبانوں میں رائج ہے، مگر ادب کی صحیح تفہیم کو جہاں تک میں سمجھتا ہوں، میں اس بات کا قائل ہوں کہ ادب کو کسی بھی صورت ہم ان دو خانوں میں نہیں بانٹ سکتے۔ اس کی ایک واضح مثال یہ ہے کہ ادب اطفال کے نام پر نصاب میں شامل کئی ایسی نظمیں ہیں جن سے زبان و ادب کے مبتدی کے ساتھ ساتھ بالغ نظر ادیب بھی استفادہ کرسکتا ہے۔ اسماعیل میرٹھی، افسر میرٹھی، مائل خیر آبادی، نظیر اکبرآبادی، علامہ اقبال، گلستاں، بوستاں وغیرہ، یہ سارے نام پختہ مشق ادیبوں کی رہنمائی کرتے ہیں، یہ وہ تخلیقی کاوشیں ہیں جو بچوں اور بڑوں میں یکساں طور سے مقبول ہیں۔ کیا اسماعیل میرٹھی کے یہاں ادب عالیہ کے نمونے نہیں ہیں؟ دراصل کوئی بھی ادیب اپنی تخلیقی قوت کی بنیاد پر زندہ رہتا ہے۔

ہاں! ادب کی منازل اور درجے ضرور ہیں، وہ قدم بہ قدم پیچیدہ ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اور جن کی تفہیم کے لیے ایک عرصہ درکار ہوتا ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ بچے کے حواس کی تربیت تخلیقی ماحول میں کی جائے۔ لفظ کے انطلاقات اور رعایتوں کے بنیادی علم سے بچے کا ذہن اشیاء کے درمیان ربط ڈھونڈنے کا عادی بنے گا اور یہی تخلیقی اضطراب کا پہلا زینہ ہے۔

جادو اور پریوں کی کہانیوں میں اخلاقی سبق کی تعلیم دی جاسکتی ہے (بشرطیکہ اخلاقی سبق تخلیقی قوت سے سروکار رکھتا ہو)، ایک طرح سے دیکھا جائے تو شاعری/ادب صرف ہماری حیرتوں میں ہی اضافہ کرتا ہے۔ تخلیق کار کے لیے یہ بھی لازم ہے کہ وہ اپنے اردگرد پھیلی ہوئی موجودات کو ایک بچے کی نظر سے دیکھے، تبھی اس کی نگاہ میں معصومیت کا عنصر شامل ہوگا۔ ان کے دیکھنے کے عمل میں دنیا کی عیاریوں کا پردہ نہ حائل ہو، سو ادب بھی استعجاب کی کیفیت کے باوصف زندگی کی حقیقتوں کا غماز بن جاتا ہے۔

محمود عاصم فلاحی، ریسرچ اسکالر جواہر لال نہرو یونیورسٹی، ای میل:
asimsherazi555@gmail.com

انگریزی زبان کی کہاوت ہے کہ ہم جو کچھ پڑھتے ہیں ہماری شخصیت اس کی آئینہ دار ہوتی ہے، we are what we read اس سے ایک قدم آگے جا کر جب ہم بچوں کے ذریعے پڑھے جانے والے علم وادب کے ان کی زندگی پر مرتب ہونے والے اثرات کا جائزہ لیتے ہیں، تو شاید اس وقت عربی زبان کی وہ مثل ہمارے سامنے ہونی چاہئے جس میں بچپن کے علم کو نقش حجر سے تعبیر کیا گیا ہے، العلم فی الصغر کالنقش فی الحجر۔ مذکورہ بالا باتیں ادب اطفال کی اہمیت کا ادراک کرنے کے لیے اشارہ کے طور پر کافی ہیں۔

دنیا کے مختلف مذاہب وافکار اور پھر ان کے ادب کا ایک بہت ہی سرسری جائزہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ انہوں نے بچوں کے لٹریچر تیار کرنے اور ان پر اپنے تہذیبی غلبے کے لیے کتنی وافر مقدار میں لٹریچر تیار کیا ہے، اور اس کو کتنی اہمیت دی ہے۔ موجودہ مغربی تہذیب کے فروغ کے وسائل پر ایک طائرانہ نظر ادب اطفال کے حوالے سے جب ہم ڈالتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ شاید جتنی توجہ ادب اطفال پر اس تہذیب نے دی ہے اتنا اہتمام دوسری تہذیبوں میں نہیں پایا جاتا۔

ادب اطفال کا لفظ جب ہم استعمال کرتے ہیں تو میری ناقص سمجھ کے مطابق اس کا دائرہ صرف بچوں کے لیے لکھی جانے والی کہانیوں، قصوں، ناولوں، نصابی کتابوں، بچوں کے میگزین، ان کے لیے خصوصی طور پر لکھی جانے والی کتابوں تک محدود نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ آج کے انفارمیشن اور ٹکنالوجی کے اس دور میں اس کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا ہے۔ موبائل پر بھیجے جانے والے پیغامات اور اس میں استعمال کیے جانے والے رموز وتشبیہات symbols & emotions سے لے کر موبائل گیم، ویڈیو گیم، ٹی وی سیریل، کارٹون، کھلونے اور یہاں تک کہ لباس اور زندگی کی روزمرہ کی حاجات کے لیے استعمال ہونے والی اشیاء اور ان کے اشتہارات بھی آج ادب اطفال کا حصہ ہیں، اور بچوں کی زندگیوں پر ان تمام چیزوں کے اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ زبان وادب کو سکھانے کے حوالے سے معاملہ یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ اب گیم اور کھیل کود کے ذریعے ہی تعلیم وتعلم کا کام ہو رہا ہے۔ کنڈرگارڈن اور پلے اسکول جیسے تعلیمی نظریہ کا رجحان شاید وہیں سے آیا ہے۔

ادب اطفال میں بڑھ رہے تنوع کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کو اسلام سے ہم آہنگ کرنے کی ضرورت آج کے دور میں بڑھ گئی ہے۔ جدید وسائل وذرائع کو استعمال کرتے ہوئے ایک دلکش اور

دلچسپ لٹریچر تیار کرنا وقت کی ضرورت ہے۔ ماضی میں پائے جانے والے دیو مالائی قصے اور اسنو وہائٹ جیسی کہانیاں اب بچوں کے لیے دلچسپی کا سامان پیدا کرنے میں ناکافی ثابت ہورہی ہیں۔لیکن یہی چیزیں جب چھوٹا بیم، ڈورے مون اور ٹمپل رن کی شکل میں آتی ہیں تو وہ جہاں ایک طرف تفریح کا سامان فراہم کرتی ہیں، وہیں اپنے ساتھ نظریات اور افکار کا جھونکا بھی لاتی ہیں۔جس کے اثرات بچوں کے معصوم ذہنوں پر لاشعوری طور پر پڑتے ہیں اور وہ اپنے مسائل کو حل کرنے کے لیے انہیں ہیرو تسلیم کرتے ہیں۔اس طرز پر اسلامی روح کے ساتھ جدید وسائل وذرائع کی زبان میں لٹریچر تیار کرنا ایک اہم ذمہ داری ہے جس کی اہمیت کا ادراک ہر حساس شخص کو ہونا چاہئے۔

محمد اکمل فلاحی،استاذ جامعۃ الفلاح۔موبائیل نمبر:9621458461

جس قدر بچے اہم ہیں اسی قدر ان کی تربیت بھی اہم ہے۔بچوں کی تربیت اگر صحیح رُخ پر نہ کی گئی تو یہی بچے اپنی قوم وملت کے لیے نفع بخش ہونے کے بجائے مضر ثابت ہوں گے۔ترقی پذیر دور میں ان کے اخلاق وکردار کو بگاڑنے کے لیے جدید وسائل وذرائع کافی نقصاندہ ثابت ہورہے ہیں،اس لیے وقت کا تقاضا ہے کہ ہم ان کے لیے مطلوبہ لٹریچر (وسیع مفہوم میں) تیار کریں تاکہ ان کی شخصیت کی ہمہ جہت ترقی ہوسکے۔

آج کے بچے کل کے معمار ہیں، کسی قوم وملک کا مستقبل انہی بچوں سے وابستہ ہوا کرتا ہے۔بچوں کو نظر انداز کرکے اگر کوئی قوم یا ملک ترقی کرنا چاہے، کامیاب ہونا چاہے، اور کوئی کارنامہ انجام دینا چاہے تو ممکن نہیں۔اس لیے بچوں کی اہمیت کو ہر دور میں تسلیم کیا جاتا رہا ہے اور ان پر خصوصی توجہ دی جاتی رہی ہے۔دورِ حاضر میں بچوں کے رجحانات وجذبات اور ان کی نفسیات کو خاص موضوع بحث بنایا جارہا ہے،ان کی ہمہ جہت ترقی کے لیے ماہرین تعلیم وتربیت گوناگوں کوششیں کررہے ہیں۔

جس بچہ کو اچھی تربیت نصیب ہوگئی، وہ سماج کا بہترین فرد بن گیا اور جو اس سے محروم رہ گیا وہ خود اپنے لئے بھی اور سماج وملک کے لیے بھی نقصان دہ ثابت ہوا۔اس لئے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ فرد اور جماعت کی کامرانی کا دارومدار صحیح اور موزوں تربیت پر ہے۔جن افراد اور قوموں نے اپنے بچوں کی بہترین تربیت کا نظم کیا ان کے بچے دنیا میں سورج کی طرح چمکتے رہے، جو تاریکی میں تھے انہیں روشنی کی شاہراہ پر لا کھڑا کیا،غفلت کی نیند سے جگا کر دانشمندی اور ہوشیاری کے ایوان میں پہنچادیا۔اور جن لوگوں نے اپنی اولاد کی اچھی تربیت نہیں کی ان کے بچے بے راہ روی کا شکار ہوگئے،بچپن سے جوانی تک ساری عمر کو خاک میں ملادیا،اپنے مستقبل کو روشن کرنے کے بجائے تاریک سے تاریک تر بنادیا۔اس لئے بچوں کی تربیت پر خاص توجہ دی جانی چاہئے۔

جہاں تک بچوں کی تربیت کے لیے لٹریچر یا ادبِ اطفال کی بات ہے،مطلوبہ ادبِ اطفال ایسا ہونا

چاہئے جو ان کی فطری صلاحیتوں کو پروان چڑھاتا ہو، ان کے احساسات وجذبات کو صحیح رخ پر ڈالتا ہو، جوان کے اخلاق وکردار کو سنوارتا ہو، ان کے اندر وفاداری کا شعور پیدا کرتا ہو، انہیں حق پرستی کی تعلیم دیتا ہو، انہیں علم ومعرفت کی نئی راہیں دکھاتا ہو، اور انہیں غور وفکر کا خوگر بناتا ہو۔

موجودہ دور میں تعلیم وترقی کے نام پر فنون لطیفہ میں ایسی ایسی چیزیں شامل کر لی گئی ہیں، اور انہیں بچوں کے لیے پیش کیا جارہا ہے، جو بچوں کے لیے سم قاتل ہیں۔ جیسے فحش لٹریچر، فحش فلمیں، فحش گانے، جنسی جذبات کو برانگیختہ کرنے والی عریاں تصویریں۔ ان کے سدّ باب کے لیے ضروری ہے کہ بچوں کے لیے ان کی عمر کے لحاظ سے ایسا لٹریچر تیار کیا جائے جو ایک طرف انہیں بے حیائی، فحاشی، بدکاری، جھوٹ، اور مکر وفریب کے برے اثرات سے دور رکھ سکے، اور دوسری طرف ان کے اندر ذمہ داری کا احساس اور صحیح شعور پیدا کر سکے تاکہ کل وہ سماج میں اپنا بہترین رول ادا کر سکیں۔ اسی پر بس نہ کیا جائے بلکہ موجودہ وسائل تعلیم وتربیت کو استعمال میں لاکر ہر میدان میں ان کی عمر وصلاحیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے وہ تمام چیزیں تیار کی جائیں جو انہیں علم وہنر اور اخلاق وکردار کے اعلی مقام تک پہنچا سکیں۔

ترقی پذیر وسائل کے تناظر میں اگر یہ بات کہی جائے کہ بچوں کا موجودہ لٹریچر ان کی ہمہ جہت تربیت کے لیے کسی حد تک ناکافی ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس کے لئے مستقبل میں ہمہ جہتی کام کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے ارباب حل وعقد کی خدمت میں چند مشورے پیش کرنا مناسب ہوگا:

۱۔ ایسے افراد کا انتخاب کیا جائے جو اس میدان کے ماہر ہوں۔
۲۔ دنیا کی رائج الوقت زبان میں منتخب افراد سے خاطر خواہ لٹریچر تیار کرائے جائیں۔
۳۔ عام فہم اور آسان زبان کا سہارا لیا جائے۔
۴۔ ان کی نفسیات کا پورا پورا لحاظ کر کے ان کی دلچسپی کا سامان فراہم کیا جائے۔
۵۔ نئے وسائل کا بھرپور استعمال کیا جائے۔
۶۔ تمام صنفوں، ناول، افسانوں، ڈراموں، اور قصوں وغیرہ میں کام کیا جائے۔

سید محمد سلمان فلاحی، نئی دہلی۔ موبائل نمبر:9868562795

بچوں کی تربیت میں ادب کا بہت اہم مقام ہے۔ بچوں کا ذہن بہت صاف شفاف ہوتا ہے اور ادب اپنے اندر وہ تاثیر رکھتا ہے جو ذہنوں میں اپنے انمٹ نقوش ثبت کر جاتا ہے۔

عرب کی یہ تہذیب تھی کہ بچہ جب پیدا ہوتا تھا تو اس کے سامنے تلوار، خنجر اور نیزے وغیرہ رکھ دیئے جاتے تھے اور جب وہ تھوڑا بڑا ہوتا تو اسے بہادری کے قصے سنائے جاتے، عمرو بن کلثوم اپنے قبیلہ

کی شان میں کہتا ہے:

اذا بلغ الفطام لنا صبی تخر له الجبابر ساجدینا

(اور ہمارے بچوں کا حال یہ ہے کہ جب وہ دودھ چھڑانے کی عمر کو پہنچتے ہیں تو بڑے بڑے سکندر و داران کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتے ہیں۔)

بظاہر تو یہ شعر مبالغہ آمیز معلوم ہوتا ہے تاہم یہ اپنے اندر بہادری کی شاندار روایات سموئے ہوئے ہے۔یہی وجہ ہے کہ یہ بچے جب بڑے ہو کر میدان جنگ میں پہنچتے تو گھوڑوں کی ٹاپوں اوران کی تلواروں اور نیزوں کی گھن گرج سے ان پر کچھ اثر نہیں پڑتا تھا اور وہ بے خطر میدان میں کود پڑتے تھے۔۔۔لیکن۔۔ موجودہ تہذیب۔۔آج کا کلچر۔۔۔مائیں بچوں کو ڈراتی ہیں کہ سو جاؤ، ورنہ Monkey آجائے گا۔۔!!

ضرورت ہے کہ آج بچوں کی ذہن سازی اور اچھی اٹھان پر توجہ دی جائے، انہیں مثبت اور تعمیری قسم کی چیزیں اور حوصلہ بخش واقعات سنائے جائیں، ان کو نبی اکرمؐ کے اخلاق حسنہ سے متعارف کرایا جائے، صحابہ کرام کی زندگیوں سے واقف کرایا جائے، خالد بن ولید، محمد بن قاسم، طارق بن زیاد، صلاح الدین ایوبی کے واقعات سنائے جائیں، غرض ان کو ایسی کہانیاں، قصے اور باتیں سنائی اور پڑھائی جائیں جو ان کے اندر بچپن سے مثبت اور تعمیری سوچ کو پروان چڑھا سکیں۔

آج کا ڈیجیٹلائز دور ہمارے سامنے چیلنج نہیں ہے، بلکہ مسئلہ یہ ہے کہ بچوں کے لیے عمدہ ادب ہم پیش نہیں کر پا رہے ہیں۔ مائل خیرآبادی نے تو اس میدان میں بڑا کام کیا، تاہم ان کی اس فکر اور اس روایت کو حقیقی جانشین نہیں مل سکا۔

عصر حاضر کے ایک ادیب ہیں 'شہاب الدین' جنہوں نے بچوں کے لیے بہت سے ناول اور کہانیاں لکھی ہیں، جو سائنس اور دلچسپ معلومات پیش کرتی ہیں، لیکن ان کے یہاں وہ اصلاحی پہلو نہیں دیکھنے کو ملتا جو مائل خیرآبادی کا امتیاز تھا۔ جبکہ کچھ ادیبوں نے اصلاحی پہلو کو تو سامنے رکھا، لیکن وہ اس طرح کی دلچسپ چیزیں پیش نہیں کر سکے، جو بچوں کو اپنی جانب راغب کر سکیں۔ مختصر یہ کہ اصلاحی اور تربیتی پہلو سے دیکھا جائے تو بچوں کے ادیب خال خال ہی ملیں گے۔ بچوں کے لیے جو رسالے نکلتے ہیں 'نور'، 'ہلال'، 'امنگ'، 'اچھا ساتھی' وغیرہ ان میں بھی اب وہ بات نہیں رہی، جو رہنی چاہئے اور کبھی دیکھنے کو ملتی تھی۔

آج کے بچے ہی ہمارا مستقبل ہیں، ان کی طرف توجہ دینا از حد ضروری ہے ؎

وہ کل کے غم و عیش پہ کچھ حق نہیں رکھتا
جو آج خود افروز و جگر سوز نہیں ہے
وہ قوم نہیں لائق ہنگامۂ فردا
جس قوم کی تقدیر میں افروز نہیں ہے

مروہ سبحانی فلاحی، معلّمہ کلیۃ البنات، جامعۃ الفلاح

زمانۂ قدیم میں دادی نانی کے قصّے کہانیوں کو غیر معمولی رواج حاصل تھا۔ پڑھنے لکھنے کی سہولیات حاصل نہ ہونے کی وجہ سے بچوں کا لٹریچر کتابوں میں محفوظ نہ ہوکر لوگوں کے ذہنوں میں محفوظ تھا اور وہ اسے اپنی آنے والی نسلوں تک منتقل کرتے تھے۔ اس دور کے انسان کو بھی اس بات کی اہمیت سے انکار نہیں تھا کہ بچے کا ذہن ایک سادہ ورق کی طرح ہوتا ہے کہ اس میں جس طرح کے بھی رنگ بھر دیئے جائیں بڑے ہوکر بچے کی شخصیت ان ہی رنگوں میں ابھرتی ہے۔ چنانچہ مائیں بچپن سے ہی اپنے بچوں کو اسلاف کی بہادری وشجاعت کے قصے سنایا کرتی تھیں۔ جانوروں کی زبانی ضابطۂ اخلاق سے متعلق کہانیوں کو بھی غیر معمولی مقبولیت حاصل تھی، بچے اپنے متعین وقت پر دادی نانی کے گرد گھیرا ڈال کر بیٹھ جاتے اور ان سے مختلف اخلاقی وتاریخی قصّے سنا کرتے، اس طرح بچوں کی شخصیت بچپن سے ہی مختلف اعلیٰ اخلاقی قدروں کے ساتھ پروان چڑھا کرتی تھی۔ ان کے اندر شرافت ومروت، غیرت وحمیت، شجاعت وبہادری، انسانیت وہمدردی، مقصد سے آگاہی اور اس کے لیے کچھ کر گزرنے کا جذبہ موجزن رہتا تھا۔ مگر اب وقت کی تیز رفتاری نے ان چیزوں کو بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ خاص کر نسلوں کے درمیان بڑھتے ہوئے گیپ نے تو بچوں کو دادی نانی کے قصّے کہانیوں سے بھی محروم کردیا ہے۔ والدین اپنی مصروفیات کے تئیں بچوں کو وقت دینے سے قاصر ہیں۔ اور اس پر مزید حیرت کی بات یہ ہے کہ قوم کے شاعر وادیب، مؤرخین اور قصہ نگار حضرات بھی بچوں کے لٹریچر کے سلسلے میں تشویشناک کوتاہی کا مظاہرہ کررہے ہیں۔ حالانکہ ڈاکٹر ناصر الدین الأسد ادب اطفال کی ضرورت واہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں: أدب الأطفال كا لفيتامينات للفكر يحتاج عقله و خياله الى انواع مختلفة منه، كل نوع يغذى جانبا من تفكيره وشعوره و نواحي الخيال فيه۔ (الموقف الادبی: شمارہ: ۴۰۰/صفحہ: ۱۵۰)

دوسری جانب مغربی دنیا اس سلسلے میں غیر معمولی بیداری اور مستعدی کا ثبوت دے رہی ہے۔ آئے دن بچوں سے متعلق نئی نئی کتابیں اور چینل منظر عام پر آرہے ہیں۔ جو مکمل طور سے مغربی افکار وخیالات کا رنگ لئے ہوئے ہیں۔ بچے اپنا زیادہ تر وقت انہی چینلوں کے ساتھ گزارتے ہیں اور انہی افکار کے سائے تلے پروان چڑھتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں آج ہمارے گھروں میں ایسی نسل تیار ہورہی ہے جو مذہب، اخلاقیات اور اقدار ہر چیز سے نابلد، مغربی افکار ومعتقدات کی حامل ہے۔ غرضیکہ اس مخرب اخلاق لٹریچر نے بچوں کی شخصیت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے۔

صورتحال ایک فوری، مکمل اور منظّم منصوبہ بندی کی متقاضی ہے۔ بچوں کے لیے ایسی کتابیں اور سیریلس ریلیز کرنے کی ضرورت ہے جو انہیں صحیح سمت پر لگاسکیں، بچوں کے وہ رسالے جو اپنے اصل منہج

سے بھٹک گئے ہیں انہیں منزل دکھانے کی ضرورت ہے۔اسلاف کی روشن تاریخ کو ویژول میڈیا کے ذریعے کچھ ایسے دلچسپ انداز میں بچوں کے سامنے پیش کرنے کی ضرورت ہے جو ان کے لئے چھوٹا بیم، ٹام اینڈ جیری، اور بال ویر وغیرہ کا نعم البدل ثابت ہو سکے، اور وہ اس کی روشنی میں اپنے افکار و خیالات کو صحیح سمت دے سکیں اور ایک پاکیزہ، کامیاب اور بامقصد زندگی کے سفر کا آغاز کر سکیں۔عرصہ ہوا مائل خیرآبادی، اور نسیم حجازی نے کچھ ایسی ہی کوششوں کا آغاز کیا تھا، جو بدقسمتی سے ہماری کوتاہیوں کی نذر ہو گئیں۔اس کی جانب پھر سے توجہ دینے اور اسے آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔

عمار جاوید القسوری، جامعۃ الامام، ریاض، سعودی عرب۔ای میل:ammarjawedkhan@gmail.com

بچوں کی تعلیم و تربیت اور ان کی ذہن سازی کا سب سے مؤثر اور آسان طریقہ یہ ہے کہ بچوں کے لیے بہترین ادب کا انتخاب کیا جائے، ان کو ایسی کتابوں کا مطالعہ کروایا جائے جو ادب اطفال کی شاہکار ہوں، ایسی کتابیں جن کے لکھنے کا مقصد صرف تفریح نہ ہو، ایسی کتابیں جو بچوں کی بہترین ذہن سازی کے لیے معاون ہوں، جو بچوں کی دلچسپی اور تفریح کے ساتھ ساتھ ان کو دینی تعلیمات اور اخلاقی قدروں سے بھی متعارف کرا سکیں، ایسی کتابیں جو بچوں کی فکری اور علمی تربیت کا کام انجام دیں۔

آنے والی نسلوں کو اسلامی تہذیب و ثقافت سے روشناس کرانے کے لیے اور ان کی ذہنی اور علمی تربیت کرنے کے لیے ضروری ہے کہ بچوں کے اندر کتابوں کے مطالعہ کا شوق پیدا کیا جائے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہم بچوں کے لیے ایسا ادب فراہم کریں، ان کے لیے ایسی کتابیں تیار کریں جو ان کے مزاج اور دلچسپیوں کا مکمل خیال کرتے ہوئے ان کی تعلیم و تربیت کا سامان کریں۔

آج ہم دیکھتے ہیں کہ بچے کس قدر شوق سے گھنٹوں ٹی وی کے سامنے کارٹونس دیکھ کر گزار دیتے ہیں اور جو کچھ بھی دیکھتے ہیں ان کو پریکٹیکل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، چنانچہ کئی بار تو ایسی خبریں بھی سننے کو ملتی ہیں کہ بچہ اسپائڈر مین اور بیٹ مین جیسے سپر ہیروز کے کارٹونس دیکھ کر حادثے کا شکار ہو گیا۔

American Academy of Pediatrics اور American Academy of Child and Adolescent psychiatry کی تحقیق کے مطابق یہ چیز بچوں کی فطرت میں شامل ہے کہ وہ جو کچھ دیکھتے ہیں اپنی عملی زندگی میں بھی اسی طرح کی حرکتیں کرتے ہیں، جس کو بھی وہ اپنا پسندیدہ ہیرو مانتے ہیں اس کی بھرپور نقل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، چنانچہ جو کچھ وہ دیکھتے ہیں وہ ان کی عملی زندگی پر زبردست طریقہ سے اثرانداز ہوتی ہے۔اس سے پتہ چلتا ہے کہ بچے اسی طرف مائل

ہوتے ہیں اور اسی چیز میں اپنا وقت گزارنا چاہتے ہیں جس میں ان کی دلچسپی کا خوب سامان ہو، اور جو چیز ان کے مزاج اور طبیعت کو پیش نظر رکھ کر تیار کی گئی ہو۔ اور دوسری چیز یہ معلوم ہوئی کہ بچے جو کچھ بھی سنتے اور دیکھتے ہیں اور جس کو اپنا پسندیدہ ہیرو مانتے ہیں اپنی عملی زندگی میں بھی اسی کی نقل کرتے ہیں، بلکہ اس کو اپنا آئیڈیل مان کر اسی کی طرح بننے کی کوشش کرتے ہیں۔

اب اگر ہم چاہتے ہیں کہ بچوں کی ذہن سازی اور ان کی تربیت اسلامی تعلیمات کے مطابق کی جائے، اگر ہم چاہتے ہیں کہ مسلم دنیا کے نونہال اپنا ہیرو اسپائڈر مین اور بیٹ مین کو بنانے کے بجائے حضرت عمرؓ، حضرت خالد بن ولیدؓ اور محمد بن قاسمؒ کو بنائیں، اگر ہم چاہتے ہیں کہ نئی نسل کے بچے جتنا وقت Pokeman ،Beauty and The Beast اور Ben Ten جیسے وقت کو ضائع کرنے والے اور بے مقصد کارٹونس دیکھنے میں لگاتے ہیں، اتنا وقت کسی ایسے کام میں لگائیں جو ان کی تعلیم و تربیت کے لحاظ سے مفید ہو تو ہم کو پرنٹ میڈیا کے ساتھ ساتھ ویژول میڈیا کا بھی بھرپور استعمال کرنا ہوگا۔

بچوں کے لیے نفع بخش اور معیاری ادب مہیا کرنے کے لیے ایسی کتابیں فراہم کرنی ہوں گی جو بھرپور دلچسپی اور تفریح کا سامان رکھتی ہوں اور دینی، اخلاقی اور فکری پرواز کو بھی بلند کرنے والی ہوں، وہیں ایسے ویڈیوز اور کیسٹ بھی تیار کرنے ہوں گے جو محض تفریح کے لیے نہ ہوں بلکہ تفریح کے ساتھ ساتھ وہ بچوں کے اندر جوش و جذبہ اور زندگی میں کچھ کر دکھانے کا حوصلہ پیدا کریں اور اسلامی تعلیمات اور اخلاقی قدروں کی عکاس ہوں۔ ہمیں ایسی ویڈیوز تیار کرنی ہوں گی جو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ جیسے اسلامی قائدین کو لے کر بنائی جائیں کیونکہ بچے جب ایسی ویڈیوز دیکھیں گے تو انہی کو اپنا ہیرو بھی بنائیں گے اور اپنی عملی زندگی میں انہی کی تقلید کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس سلسلے میں قطر سے بننے والی 'عمر سیریز' ایک شاہکار اور بہترین مثال ہے، اس سیریز میں قابل تقلید مسلم سماج، اسلامی تعلیمات اور مسلم ہیروز کی تاریخ بہترین اور دلچسپ انداز میں بیان کی گئی ہے، چنانچہ بچے جب اس طرح کی ویڈیوز دیکھیں گے تو اسی کے مطابق ان کی ذہن سازی ہوگی جس کا ان کی عملی زندگی پر گہرا اثر پڑے گا۔

آئندہ شمارے کا خصوصی موضوع

(۱) آئندہ شمارے کے لیے خصوصی کالم کا موضوع ''**اسلام سے متعلق غلط فہمیوں کا ازالہ: کیوں اور کیسے**؟'' اور اس کے بعد والے شمارے کا موضوع ''**مسلمانوں کے معاشرتی مسائل کی صحیح تشخیص: کیوں اور کیسے**؟'' متعین کیا گیا ہے۔

(۲) موضوع سے دلچسپی رکھنے والے اہل فکر و نظر اپنے افکار و خیالات اس طرح ارسال کریں کہ **۱۵/ اکتوبر** تک ہمیں لازماً موصول ہو جائیں۔

(۳) کوشش رہے کہ تحریر جامع اور مختصر ہو، اور حیات نو کے **۲/ صفحات** سے زیادہ طویل نہ ہو۔

اردو تراجم قرآن پر ایک نظر (۹)

(مولانا محمد امانت اللہ اصلاحی کے افادات کی روشنی میں)

ڈاکٹر محی الدین غازی، ای میل:mohiuddin.ghazi@gmail.com

اس مضمون میں اس کی ضرورت نہیں محسوس کی گئی کہ قرآن مجید کے ترجمہ کا اہم اور عظیم کام کرنے والوں کی تحسین میں کچھ رقم کیا جائے کہ اتنی عظیم خدمت مختلف شخصیات کے ذریعہ جس قدر ہمت واہتمام سے انجام دی گئی، وہ محتاج بیان وستائش نہیں ہے۔

پیش نظر تحریر میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ قرآن مجید کے ترجمہ کا کام بہت ضروری مگر نازک عمل ہے، اس میں غلطی کے امکانات کو کم سے کم کرتے رہنے کی مسلسل کوشش ضروری ہے، قرآن اللہ کا کلام ہے، تاہم اس کلام کا ترجمہ ایک انسانی کوشش ہوتی ہے، جس میں غلطیوں کا امکان ہمیشہ باقی رہتا ہے، اسی لئے جو ترجمہ جتنا زیادہ مشہور ومتداول ہے اس کا بار بار گہرائی اور باریک بینی سے جائزہ لیتے رہنا بھی اسی قدر زیادہ ضروری ہے۔ اس جائزہ میں نہ کسی طرح کا احترام مانع ہونا چاہئے اور نہ کوئی نسبت حائل ہونی چاہئے، راقم کی رائے میں ہونا تو یہ چاہئے کہ ترجمہ قرآن کا کام اجتماعی طور پر اکیڈمی کی سطح پر اور متعدد بار متعدد ماہرین لغت کی نظر سے گذرنے کے بعد قابل اشاعت سمجھا جائے، اور اشاعت کے بعد بھی نظر ثانی کا کام جاری رہے۔ لیکن بوجوہ تراجم قرآن کے ساتھ ایسا اہتمام نہیں ہوسکا۔ عام طور سے ہر ترجمہ قرآن ایک انفرادی کوشش رہی ہے، اور اس لئے غلطیوں کا امکان کسی نہ کسی حد تک ہر ترجمہ میں پایا جاتا ہے۔

----

(۶۱)　فعل ''کاد'' کا درست ترجمہ

جب کسی فعل سے پہلے کـاد فعل آتا ہے تو مطلب ہوتا ہے کہ وہ کام ہونے کے قریب تو ہو گیا لیکن ہوا نہیں، کیونکہ ہو جانے کی صورت میں کاد نہیں لگتا ہے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے:

وَأَنَّهُ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللَّهِ يَدْعُوهُ كَادُوا يَكُونُونَ عَلَيْهِ لِبَداً۔ (الجن:۱۹)

''اور جب اللہ کا بندہ اس کی عبادت کے لیے کھڑا ہوا تو قریب تھا کہ وہ بھیڑ کی بھیڑ بن کر اس پر پل پڑیں''۔ (محمد جوناگڑھی)

''اور یہ کہ جب اللہ کا بندہ اُس کو پکارنے کے لئے کھڑا ہوا تو لوگ اُس پر ٹوٹ پڑنے کے لیے تیار ہو گئے''۔ (سید مودودی، اس ترجمے میں ''تیار ہو گئے'' درست نہیں ہے، یہ لفظ کـاد کی صحیح ترجمانی نہیں کرتا ہے)

جن آیتوں میں فعل کاد آیا ہے، وہاں عام طور سے مترجمین نے اس مفہوم کا لحاظ کیا ہے، البتہ مذکورہ ذیل آیت میں لگتا ہے کہ بعض لوگوں سے اس کی رعایت نہیں ہو سکی۔

لَقَد تَّابَ الله عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهَاجِرِيْنَ وَالأَنصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوهُ فِي سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِن بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ إِنَّهُ بِهِمْ رَؤُوفٌ رَّحِيْمٌ۔ (التوبۃ:۱۱۷)

''اللہ نے نبی اور ان مہاجرین و انصار پر رحمت کی نظر کی جنھوں نے نبی کا ساتھ تنگی کے وقت میں دیا، بعد اس کے کہ ان میں سے کچھ لوگوں کے دل کجی کی طرف مائل ہو چکے تھے، پھر اللہ نے ان پر رحمت کی نگاہ کی، بے شک وہ ان پر نہایت مہربان اور رحم فرمانے والا ہے''۔ (امین احسن اصلاحی)

''اللہ نے معاف کر دیا نبی کو اور ان مہاجرین و انصار کو جنہوں نے بڑی تنگی کے وقت میں نبی کا ساتھ دیا اگر چہ ان میں سے کچھ لوگوں کے دل کجی کی طرف مائل ہو چکے تھے (مگر جب انہوں نے اس کجی کا اتباع نہ کیا بلکہ نبی کا ساتھ ہی دیا تو) اللہ نے انہیں معاف کر دیا، بے شک اُس کا معاملہ اِن لوگوں کے ساتھ شفقت و مہربانی کا ہے''۔ (سید مودودی)

''بیشک خدا نے پیغمبر اور ان مہاجرین و انصار پر رحم کیا ہے جنہوں نے تنگی کے وقت میں پیغمبر کا ساتھ دیا ہے جب کہ ایک جماعت کے دلوں میں کجی پیدا ہو رہی تھی پھر خدا نے ان کی توبہ کو قبول کر لیا کہ وہ ان پر بڑا ترس کھانے والا اور مہربانی کرنے والا ہے''۔ (محمد حسین نجفی)

''مائل ہو چکے تھے''، یا ''کجی پیدا ہو رہی تھی'' کہنا نہ تو صورت واقعہ کی رو سے صحیح ہے، اور نہ ہی آیت کے الفاظ اس پر دلالت کرتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں حسب ذیل دونوں ترجمے الفاظ کے مطابق ہیں:

''بیشک اللہ کی رحمتیں متوجہ ہوئیں ان غیب کی خبریں بتانے والے اور ان مہاجرین اور انصار پر

جنہوں نے مشکل کی گھڑی میں ان کا ساتھ دیا بعد اس کے کہ قریب تھا کہ ان میں کچھ لوگوں کے دل پھر جائیں پھر ان پر رحمت سے متوجہ ہوا بیشک وہ ان پر نہایت مہربان رحم والا ہے''۔(احمد رضا خان)

''بیشک خدا نے پیغمبر پر مہربانی کی اور مہاجرین اور انصار پر جو باوجود اس کے کہ ان میں سے بعضوں کے دل جلد پھر جانے کو تھے۔مشکل کی گھڑی میں پیغمبر کے ساتھ رہے۔ پھر خدا نے ان پر مہربانی فرمائی۔ بیشک وہ ان پر نہایت شفقت کرنے والا (اور) مہربان ہے''۔(فتح محمد جالندھری)

(۶۲) ''فاسلکوہ'' کا ترجمہ

خُذُوهُ فَغُلُّوهُ۔ ثُمَّ الْجَحِيمَ صَلُّوهُ۔ ثُمَّ فِي سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُونَ ذِرَاعاً فَاسْلُكُوهُ۔ (الحاقۃ:۳۰۔۳۲)

''(حکم ہوگا) پکڑو اِسے اور اِس کی گردن میں طوق ڈال دو، پھر اِسے جہنم میں جھونک دو، پھر اِس کو ستر ہاتھ لمبی زنجیر میں جکڑ دؤ'۔(سید مودودی)

''(حکم ہوگا کہ) اسے پکڑلو اور طوق پہنا دو، پھر دوزخ کی آگ میں جھونک دو، پھر زنجیر سے جس کی ناپ ستر گز ہے جکڑ دؤ'۔(فتح محمد جالندھری)

مذکورہ بالا آیتوں کے اوپر دیئے گئے دونوں ترجمہ میں فاسلکوہ کا ترجمہ ''جکڑ دؤ' کیا گیا ہے۔تصویر یہ سامنے آتی ہے کہ پہلے پکڑنا ہے، پھر گلے میں طوق ڈالنا ہے، پھر جہنم میں ڈالنا ہے، پھر ستر ہاتھ لمبی زنجیر میں اسے جکڑ دینا ہے۔اس میں سب سے بڑا اشکال یہ آتا ہے کہ اس لفظ میں جکڑنے کا مفہوم کہاں تک پایا جاتا ہے؟

اس کے مقابلے میں مذکورہ ذیل دونوں ترجمے ہیں، جن سے ایک مختلف تصویر سامنے آتی ہے، وہ یہ کہ پہلے پکڑ کر گلے میں طوق ڈال کر جہنم میں ڈال دینا ہے، اور وہاں ایک ستر ہاتھ لمبی زنجیر کو گلے میں پڑی ہوئی طوق میں ڈال دینا ہے۔اس طرح لفظ فاسلکوہ کا حق بھی ادا ہو جاتا ہے، اور جہنم میں ڈالنے کے بعد ستر ہاتھ لمبی زنجیر میں ناتھ دینے کی معنویت بھی بخوبی سامنے آجاتی ہے۔

''اسے پکڑو پھر اسے طوق ڈالو، پھر اسے بھڑکتی آگ میں دھنساؤ، پھر ایسی زنجیر میں جس کا ناپ ستر ہاتھ ہے اسے پرودؤ'۔(احمد رضا خان)

''(حکم ہوگا) پکڑو اِسے اور اِس کی گردن میں طوق ڈال دو، پھر اِسے جہنم میں جھونک دو، پھر اِس کو ستر ہاتھ لمبی زنجیر میں ناتھ دؤ'۔(امانت اللہ اصلاحی) یعنی اغلال میں زنجیر لگا دو۔

(۶۳) سأم کا مطلب

یہ لفظ مختلف مشتقات میں قرآن مجید میں تین مقامات پر آیا ہے۔اس کا ترجمہ بعض لوگوں نے تھکنا کیا ہے، اور بعض لوگوں نے اکتانا کیا ہے، جبکہ عربی لغات کی رو سے اس کا ترجمہ تعب نہیں بلکہ ملل

ہے، یعنی اکتانا نہ کہ تھکنا۔ تھکنے میں بیزاری ہونا ضروری نہیں ہے، جب کہ اکتانے میں بیزاری شامل ہوتی ہے۔ اس فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے مذکورہ ذیل آیتوں کے ترجموں پر غور کریں تو اندازہ ہوگا کہ اس فرق کی رعایت سے معنی پر کس قدر اثر پڑتا ہے۔

(۱) فَإِنِ اسْتَكْبَرُوا فَالَّذِينَ عِندَ رَبِّكَ يُسَبِّحُونَ لَهُ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَهُمْ لَا يَسْأَمُونَ۔ (فصلت:۳۸)

''لیکن اگر یہ لوگ غرور میں آکر اپنی ہی بات پر اڑے رہیں تو پروا نہیں، جو فرشتے تیرے رب کے مقرب ہیں وہ شب و روز اس کی تسبیح کر رہے ہیں اور کبھی نہیں تھکتے''۔ (سید مودودی)

''اگر یہ لوگ سرکشی کریں تو (خدا کو بھی ان کی پروا نہیں) جو (فرشتے) تمہارے پروردگار کے پاس ہیں وہ رات دن اس کی تسبیح کرتے رہتے ہیں اور (کبھی) تھکتے ہی نہیں''۔ (فتح محمد جالندھری)

''تو اگر یہ تکبر کریں تو وہ جو تمہارے رب کے پاس ہیں رات دن اس کی پاکی بولتے ہیں اور اکتاتے نہیں''۔ (احمد رضا خان)

''پھر بھی اگر یہ کبر و غرور کریں تو وہ (فرشتے) جو آپ کے رب کے نزدیک ہیں وہ تو رات دن اس کی تسبیح بیان کر رہے ہیں اور (کسی وقت بھی) نہیں اکتاتے''۔ (محمد جوناگڑھی)

یہاں بات تھکنے کی نہیں ہو رہی ہے، بلکہ بات یہ ہے کہ ایک طرف یہ متکبرین ہیں جن کے دل رب کے ذکر پر آمادہ نہیں ہیں، دوسری طرف وہ فرشتے ہیں جو اس شوق و رغبت کے ساتھ اللہ سے لو لگائے ہیں کہ رات و دن تسبیح کرتے ہیں مگر ذرا نہیں اکتاتے۔

(۲) لَا يَسْأَمُ الْإِنسَانُ مِن دُعَاءِ الْخَيْرِ وَإِن مَّسَّهُ الشَّرُّ فَيَؤُوسٌ قَنُوطٌ۔ (فصلت:۴۹)

''انسان کبھی بھلائی کی دعا مانگتے نہیں تھکتا، اور جب کوئی آفت اِس پر آ جاتی ہے تو مایوس و دل شکستہ ہو جاتا ہے''۔ (سید مودودی)

''بھلائی کے مانگنے سے انسان تھکتا نہیں اور اگر اسے کوئی تکلیف پہنچ جائے تو مایوس اور ناامید ہو جاتا ہے''۔ (محمد جوناگڑھی)

''آدمی بھلائی مانگنے سے نہیں اُکتاتا اور کوئی برائی پہنچے تو ناامید آس ٹوٹا''۔ (احمد رضا خان)

اس آیت میں بھی بات تھکنے کی نہیں بلکہ اکتانے کی ہے۔

(۳) وَلَا تَسْأَمُوا أَن تَكْتُبُوهُ صَغِيرًا أَو كَبِيرًا إِلَى أَجَلِهِ۔ (البقرۃ:۲۸۲)

''اور قرض کو جس کی مدت مقرر ہے خواہ چھوٹا ہو یا بڑا ہو لکھنے میں کاہلی نہ کرو''۔ (محمد جوناگڑھی)

''اور اسے بھاری نہ جانو کہ دین چھوٹا ہو یا بڑا اس کی میعاد تک لکھت کر لو''۔ (احمد رضا خان)

''اور قرض تھوڑا ہو یا بہت اس (کی دستاویز) کے لکھنے میں کاہلی نہ کرنا''۔(فتح محمد جالندھری)

''اور معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا اسے اپنی میعاد تک لکھ رکھنے میں اکتایا نہ کرو''۔(طاہر القادری)

''اور قرض چھوٹا ہو یا بڑا، اس کی مدت تک کے لئے اس کو لکھنے میں تساہل نہ برتو''۔(امین احسن اصلاحی)

''اور تم اس (دین) کے (بار بار) لکھنے سے اکتایا مت کرو خواہ وہ (معاملہ) چھوٹا ہو یا بڑا ہو''۔ (اشرف علی تھانوی، إِلَى أَجَلِهِ کا ترجمہ نہیں کیا)

یہاں بھی اکتانے کا مفہوم درست ہے۔

(۶۴) العراء کا ترجمہ

فَنَبَذْنَاهُ بِالْعَرَاءِ وَهُوَ سَقِيمٌ۔ (الصافات:۱۴۵)

''آخر کار ہم نے اسے بڑی سقیم حالت میں ایک چٹیل زمین پر پھینک دیا''۔(سید مودودی)

''پس انہیں ہم نے چٹیل میدان میں ڈال دیا اور وہ اس وقت بیمار تھے''۔(محمد جونا گڑھی)

''پس ہم نے ڈال دیا اس کو خشک زمین پر اور وہ نڈھال تھا''۔(امین احسن اصلاحی)

العراء کا ترجمہ عام طور سے مترجمین نے درست طور سے چٹیل میدان کیا ہے، البتہ صاحب تدبر نے خشک زمین کر دیا ہے جو اس لفظ کا درست ترجمہ نہیں ہے، خود صاحب تدبر نے دوسرے مقام پر چٹیل میدان ترجمہ کیا ہے ملاحظہ ہو:

لَوْلَا أَن تَدَارَكَهُ نِعْمَةٌ مِّن رَّبِّهِ لَنُبِذَ بِالْعَرَاءِ وَهُوَ مَذْمُومٌ ۔(القلم:۴۹)

''اگر اس کے رب کا فضل اس کی دست گیری نہیں کرتا تو وہ مذمت کیا ہوا چٹیل میدان ہی میں پڑا رہ جاتا''۔(امین احسن اصلاحی)

''اگر اس کے رب کی مہربانی اُس کے شامل حال نہ ہو جاتی تو وہ مذموم ہو کر چٹیل میدان میں پھینک دیا جاتا''۔(سید مودودی)

''اگر تمہارے پروردگار کی مہربانی ان کی یاوری نہ کرتی تو وہ چٹیل میدان میں ڈال دیئے جاتے اور ان کا حال ابتر ہو جاتا''۔(فتح محمد جالندھری)

ایک بات اور قابل غور ہے کہ سورہ قلم والی اس آیت میں صاحب تدبر نے لنبذ بالعراء کا ترجمہ کیا ہے: ''چٹیل میدان ہی میں پڑا رہ جاتا''، جبکہ دوسرے لوگوں نے کیا ہے: ''چٹیل میدان میں پھینک دیا جاتا''۔ الفاظ دونوں ترجموں کی گنجائش رکھتے ہیں، لیکن صورت واقعہ سے صاحب تدبر کے ترجمہ کی تائید ہوتی ہے، کیونکہ یہ تو واقعہ ہے کہ وہ چٹیل میدان میں پھینکے گئے تھے، البتہ اللہ کی مہربانی شامل حال ہوئی اور وہ پڑے نہیں رہ گئے اور راہ نجات حاصل ہوئی، اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ وہیں پڑے رہ جاتے۔

(۶۵) ترجمہ میں تفسیری اضافہ

قرآن مجید کے مختلف ترجموں کو پڑھتے ہوئے کہیں کہیں معلوم ہوتا ہے کہ مترجم نے ترجمہ کرتے ہوئے بعض ایسے اضافے کر دئے جن کا محل ترجمہ نہیں بلکہ تفسیر ہے، ایسے اضافے اگر قوسین کے اندر کئے جاتے ہیں تو قابل اعتراض نہیں ہوتے ہیں کیونکہ قاری یہ سمجھتا ہے کہ قوسین کے اضافے دراصل تفسیری اور توضیحی نوعیت کے ہوتے ہیں، البتہ جب قوسین کے بغیر ایسے اضافے ہوں تو وہ قابل اعتراض ٹھہرتے ہیں، کیونکہ قاری ان کو عین الفاظ قرآنی کا ترجمہ سمجھتا ہے۔اس کو حسب ذیل مثالوں سے سمجھا جا سکتا ہے:

(۱) وَبَشِّرِ الَّذِينَ آمَنُواْ وَعَمِلُواْ الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الأَنْهَارُ كُلَّمَا رُزِقُواْ مِنْهَا مِن ثَمَرَةٍ رِّزْقاً قَالُواْ هَـذَا الَّذِي رُزِقْنَا مِن قَبْلُ وَأُتُواْ بِهِ مُتَشَابِهاً وَلَهُمْ فِيهَا أَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَهُمْ فِيهَا خَالِدُون۔(البقرۃ:۲۵)

’’اور اے پیغمبر، جو لوگ اس کتاب پر ایمان لے آئیں اور (اس کے مطابق) اپنے عمل درست کر لیں، انہیں خوش خبری دے دو کہ اُن کے لیے ایسے باغ ہیں، جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی ان باغوں کے پھل صورت میں دنیا کے پھلوں سے ملتے جلتے ہونگے جب کوئی پھل انہیں کھانے کو دیا جائے گا، تو وہ کہیں گے کہ ایسے ہی پھل اس سے پہلے دنیا میں ہم کو دیے جاتے تھے ان کے لیے وہاں پاکیزہ بیویاں ہونگی، اور وہ وہاں ہمیشہ رہیں گے‘‘۔(سید مودودی)

آیت کے آئینے میں ترجمہ دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ ترجمہ میں دو مقامات پر دنیا کا تذکرہ ہے جبکہ آیت میں ایسا کوئی لفظ نہیں ہے جس کا ترجمہ دنیا سے کیا جائے، یہ ایک تفسیری اضافہ ہے جس کو قوسین میں مذکور ہونا چاہئے تھا۔

اس کے بالمقابل مذکورہ ذیل ترجمے میں الفاظ کی بھرپور رعایت کی گئی ہے:

’’اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے، ان کو خوشخبری سنا دو کہ ان کے لیے (نعمت کے) باغ ہیں، جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں۔ جب انہیں ان میں سے کسی قسم کا میوہ کھانے کو دیا جائے گا تو کہیں گے، یہ تو وہی ہے جو ہم کو پہلے دیا گیا تھا۔ اور ان کو ایک دوسرے کے ہم شکل میوے دیئے جائیں گے اور وہاں ان کے لیے پاک بیویاں ہوں گی اور وہ بہشتوں میں ہمیشہ رہیں گے‘‘۔(فتح محمد جالندھری)

یہ ترجمہ آیت کے الفاظ کے مطابق ہے۔ الفاظ کی رو سے یہ بات زیادہ قوی معلوم ہوتی ہے کہ آیت میں جنت کے پھلوں کی باہم مشابہت کو بیان کیا گیا ہے، اور اس باہمی مشابہت سے پھلوں کے انواع کی کثرت مراد ہے، کہ ہر نئے پھل کو دیکھ کر لگے گا کہ اس طرح کا پھل پہلے بھی مل چکا ہے۔

سید مودودی اور دیگر مفسرین نے جو مفہوم اختیار کیا ہے اس کی گنجائش ہو سکتی تھی اگر آیت میں كُلَّمَا کی جگہ لفظ لما ہوتا، کیونکہ كُلَّمَا کے اندر استمرار کا مفہوم ہوتا ہے اور اس کا ترجمہ ہوتا ہے جب جب اور جب کبھی، اب ظاہر ہے کہ جنت کی طویل ابدی زندگی میں ہمیشہ ہر پھل کو دیکھ کر دنیا کی مختصر زندگی کے پھلوں کو یاد کرنا قرین قیاس نہیں لگتا، اس لئے لفظ اور صورت حال کے مناسب مفہوم یہی لگتا ہے کہ وہ جنت کے پھلوں کو ان کی بے پناہ کثرت کی وجہ سے ایک دوسرے کے مشابہ قرار دیں گے۔

مولانا امانت اللہ اصلاحی کا خیال ہے کہ آیت میں پھلوں کے لئے لفظ ما کے بجائے الذی استعمال کیا گیا ہے، جس سے مفہوم یہ نکلتا ہے کہ وہ ہر نیا پھل شوق کے ساتھ لیں گے، اور کسی پھل کے سلسلے میں ناپسندیدگی یا اُکتاہٹ محسوس نہیں کریں گے۔

(۲) فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُواْ مِنْهُمْ قَوْلاً غَيْرَ الَّذِىْ قِيْلَ لَهُمْ فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِجْزاً مِّنَ السَّمَاءِ بِمَا كَانُواْ يَظْلِمُونَ۔ (الاعراف:۱۶۲)

''تو ان میں سے ان لوگوں نے جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم ڈھائے، اس کو بدل دیا کہی ہوئی بات سے مختلف بات سے۔ تو ہم نے ان پر ایک آفت سماوی بھیجی بوجہ اس کے کہ وہ اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے''۔ (امین احسن اصلاحی)

اس ترجمہ میں دو باتیں قابل توجہ ہیں ایک تو آیت کے الفاظ میں مطلق ظلم کا ذکر ہے، ''اپنی جانوں پر'' دونوں مقامات پر مترجم قرآن کا اضافہ ہے، جسے اگر ذکر کرنا تھا تو قوسین میں کرنا چاہئے تھا۔

دوسری بات یہ کہ ''اس کو بدل دیا کہی ہوئی بات سے مختلف بات'' غلط ترجمہ ہے، کیونکہ کسی اور چیز کو بدلنے کی بات نہیں ہے بلکہ جو بات کہی گئی تھی اس کو دوسری بات سے بدل دینے کا ذکر ہے۔ یہ سادہ سی بات ترجمہ کی غلطی سے گنجلک ہو گئی۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ اس آیت سے ملتی جلتی ذیل کی آیت کے ترجمہ میں مترجم نے ان دونوں پہلوؤں کی پوری رعایت کی ہے:

فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُواْ قَوْلاً غَيْرَ الَّذِىْ قِيْلَ لَهُمْ فَأَنزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُواْ رِجْزاً مِّنَ السَّمَاءِ بِمَا كَانُواْ يَفْسُقُونَ۔ (البقرۃ:۵۹)

''تو جنھوں نے ظلم کیا انھوں نے بدل دیا اس بات کو جو ان سے کہی گئی تھی دوسری بات سے۔ پس ہم نے ان لوگوں پر جنھوں نے ظلم کیا، ان کی نافرمانی کے سبب سے آسمان سے عذاب اتارا''۔ (امین احسن اصلاحی)

(۳) أَلَيْسَ اللَّهُ بِكَافٍ عَبْدَهُ وَيُخَوِّفُونَكَ بِالَّذِيْنَ مِن دُونِهِ وَمَن يُضْلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍ۔ (الزمر:۳۶)

''کیا اللہ اپنے بندے کے لئے کافی نہیں ہے؟ اور یہ تم کو ان سے ڈراتے ہیں جو اس کے سوا انھوں نے بنا رکھے ہیں۔ اور جس کو خدا گمراہ کردے اس کو کوئی ہدایت دینے والا نہیں بن سکتا ہے''۔(امین احسن اصلاحی)

اس ترجمہ میں (بِالَّذِينَ مِن دُونِهِ) کا ترجمہ ''جو اس کے سوا انھوں نے بنا رکھے ہیں'' کیا ہے، اس میں ''انھوں نے بنا رکھے'' زائد ہے، درست ترجمہ ہوگا ''جو اس کے سوا ہیں''۔

''اور یہ (کفّار) آپ کو اللہ کے سوا اُن بتوں سے (جن کی یہ پوجا کرتے ہیں) ڈراتے ہیں''۔(طاہر القادری، اس ترجمہ میں ''ان بتوں سے'' زائد ہے جس کا آیت کے الفاظ میں ذکر نہیں ہے)

آیت کا درست ترجمہ یوں ہے:

''(اے نبی) کیا اللہ اپنے بندے کے لیے کافی نہیں ہے؟ یہ لوگ اُس کے سوا دوسروں سے تم کو ڈراتے ہیں حالانکہ اللہ جسے گمراہی میں ڈال دے اُسے کوئی راستہ دکھانے والا نہیں" (سید مودودی)

(٦٦) معجزین کا ترجمہ

معجز کا لفظی ترجمہ ہے، بے بس کردینے والا، اور جب سیاق کلام میں اللہ کی پکڑ کے تذکرہ کا ہو، تو اس کا مطلب ہوگا اللہ کے قابو سے باہر نکل جانا والا۔ وجہ واضح ہے کہ کلام میں اس کی نفی نہیں کی جارہی ہے کہ وہ اللہ کو بے بس کردیں گے، بلکہ یہ بتایا جارہا ہے کہ یہ لوگ اللہ کی پکڑ سے اور اس کے عذاب کی گرفت سے بچ نہیں سکیں گے۔ عام طور سے مترجمین نے عاجز کرنے، تھکا دینے اور بے بس کرنے کا مفہوم لیا ہے، جو لفظ کے مفہوم سے قریب ہے، البتہ بعض مقامات پر بعض مترجمین نے ہرانے اور مغلوب کرنے کا ترجمہ کیا ہے، یہ ترجمہ درست نہیں ہے، کیونکہ ہرادینے اور مغلوب کردینے میں جس مقابلہ آرائی کا تصور پایا جاتا ہے اس کا یہاں ذکر نہیں ہورہا ہے۔ حسب ذیل مثالوں میں اس فرق کو محسوس کیا جاسکتا ہے:

(١) إِنَّ مَا تُوعَدُونَ لآتٍ وَمَا أَنتُم بِمُعْجِزِينَ۔ (الانعام:١٣٤)

''کچھ شک نہیں کہ جو وعدہ تم سے کیا جاتا ہے وہ (وقوع میں) آنے والا ہے اور تم (خدا کو) مغلوب نہیں کرسکتے''۔(فتح محمد جالندھری)

''جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جارہا ہے وہ آکے رہے گی، اور تم (ہمارے) قابو سے باہر نہیں جاسکتے''۔(امین احسن اصلاحی)

(٢) وَيَسْتَنبِئُونَكَ أَحَقٌّ هُوَ قُلْ إِيْ وَرَبِّي إِنَّهُ لَحَقٌّ وَمَا أَنتُمْ بِمُعْجِزِينَ۔ (یونس:٥٣)

''پھر پوچھتے ہیں کیا واقعی یہ سچ ہے جو تم کہہ رہے ہو؟ کہو' میرے رب کی قسم، یہ بالکل سچ ہے اور تم اتنا بل بوتا نہیں رکھتے کہ اسے ظہور میں آنے سے روک دو'۔ (سید مودودی)

''اور وہ تم سے پوچھتے ہیں کہ کیا یہ بات واقعی ہے؟ کہہ دو کہ ہاں، میرے رب کی قسم، یہ شدنی ہے۔ اور تم قابو سے باہر نہیں نکل سکو گے''۔ (امین احسن اصلاحی، چونکہ ما جملہ حالیہ پر لگتا ہے، اس لئے نہیں نکل سکتے، درست ترجمہ ہے، سورہ انعام والی آیت میں مترجم نے اس کی رعایت کی ہے۔)

(۳) أُولَـئِكَ لَمْ يَكُونُواْ مُعْجِزِينَ فِي الأَرْضِ۔ (ھود:۲۰)

''یہ لوگ زمین میں (کہیں بھاگ کر خدا کو) نہیں ہرا سکتے''۔ (فتح محمد جالندھری)

''نہ یہ لوگ دنیا میں اللہ کو ہرا سکے''۔ (محمد جونا گڑھی)

''یہ زمین میں خدا کے قابو سے باہر نہیں''۔ (امین احسن اصلاحی)

(۴) قَالَ إِنَّمَا يَأْتِيكُم بِهِ اللّهُ إِن شَاء وَمَا أَنتُم بِمُعْجِزِينَ۔ (ھود:۳۳)

''نوح نے جواب دیا: ''وہ تو اللہ ہی لائے گا، اگر چاہے گا، اور تم اتنا بل بوتا نہیں رکھتے کہ اسے روک دو''۔ (سید مودودی)

''جواب دیا کہ اسے بھی اللہ تعالیٰ ہی لائے گا اگر وہ چاہے اور ہاں تم اسے ہرانے والے نہیں ہو''۔ (محمد جونا گڑھی)

''نوح نے کہا کہ اس کو خدا ہی چاہے گا تو نازل کرے گا۔ اور تم (اُس کو کسی طرح) ہرا نہیں سکتے''۔ (فتح محمد جالندھری)

''اس نے جواب دیا کہ اس کو تو تم پر اللہ ہی لائے گا اگر وہ چاہے گا اور تم اس کے قابو سے باہر نہ نکل سکو گے''۔ (امین احسن اصلاحی، یہاں بھی ما کی وجہ سے حال کا ترجمہ کرنا چاہئے، درست ترجمہ ہے، تم اس کے قابو سے باہر نہیں نکل سکتے)

(۵) لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا مُعْجِزِينَ فِي الْأَرْضِ وَمَأْوَاهُمُ النَّارُ وَلَبِئْسَ الْمَصِيرُ۔ (النور:۵۷)

''اور ایسا خیال نہ کرنا کہ تم پر کافر لوگ غالب آ جائیں گے (وہ جا ہی کہاں سکتے ہیں) ان کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے''۔ (فتح محمد جالندھری)

''یہ خیال آپ کبھی بھی نہ کرنا کہ منکر لوگ زمین میں (ادھر ادھر بھاگ کر) ہمیں ہرا دینے والے ہیں، ان کا اصلی ٹھکانا تو جہنم ہے جو یقیناً بہت ہی برا ٹھکانا ہے''۔ (محمد جونا گڑھی)

''ان کافروں کی نسبت یہ گمان نہ کرو کہ یہ زمین میں ہمارے قابو سے باہر نکل جائیں گے۔ اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ بے شک نہایت ہی برا ٹھکانا ہے''۔ (امین احسن اصلاحی)

(۶) فَأَصَابَهُمْ سَيِّئَاتُ مَا كَسَبُوا وَالَّذِيْنَ ظَلَمُوا مِنْ هٰؤُلَاء سَيُصِيبُهُمْ سَيِّئَاتُ مَا كَسَبُوا وَمَا هُم بِمُعْجِزِيْنَ۔(الزمر:۵۱)

''پھران کی تمام برائیاں ان پرآ پڑیں،اوران میں سے بھی جو گناہ گار ہیں ان کی کی ہوئی برائیاں بھی اب ان پرآ پڑیں گی، یہ(ہمیں) ہرادینے والے نہیں''۔(محمد جوناگڑھی)

''توان پر پڑ گئیں ان کی کمائیوں کی برائیاں اور وہ جو ان میں ظالم ہیں عنقریب ان پر پڑیں گی ان کی کمائیوں کی برائیاں اور وہ قابو سے نہیں نکل سکتے''۔(احمد رضا خان)

(۷) وَمَا أَنتُم بِمُعْجِزِيْنَ فِيْ الْأَرْضِ وَمَا لَكُم مِّن دُونِ اللّٰهِ مِن وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ۔(الشوریٰ:۳۱)

''اورتم زمین میں (پناہ لے کراس کو) ہرانہیں سکتے اور خدا کے سواتمہارا کوئی بھی حامی و مددگار نہیں''۔(اشرف علی تھانوی)

''اورتم زمین میں قابو سے نہیں نکل سکتے اور نہ اللہ کے مقابل تمہارا کوئی دوست نہ مددگار''۔(احمد رضاخان)

(۸) قَدْ قَالَهَا الَّذِيْنَ مِن قَبْلِهِمْ فَمَا أَغْنَى عَنْهُم مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ۔ فَأَصَابَهُمْ سَيِّئَاتُ مَا كَسَبُوا وَالَّذِيْنَ ظَلَمُوا مِنْ هٰؤُلَاء سَيُصِيبُهُمْ سَيِّئَاتُ مَا كَسَبُوا وَمَا هُم بِمُعْجِزِيْنَ۔ (الزمر:۵۰۔۵۱)

''ان سے پہلے والوں نے بھی یہ بات کہی تو ان کی کمائی ان کے کچھ کام آنے والی نہ بنی، پس ان کے اعمال کے برے نتائج ان کے سامنے آئے اور ان لوگوں میں سے بھی جنھوں نے شرک کیا ہے، ان کے سامنے ان کے اعمال کے برے نتائج جلد آ کے رہیں گے۔اور یہ ہم کو ہرانے والے نہیں بن سکتے''۔(امین احسن اصلاحی، ظَلَمُوا کا ترجمہ شرک کیا کرنا درست نہیں ہے۔)

''ان سے اگلے بھی یہی بات کہہ چکے ہیں پس ان کی کارروائی ان کے کچھ کام نہ آئی، پھران کی تمام برائیاں ان پرآ پڑیں، اوران میں سے بھی جو گناہ گار ہیں ان کی کی ہوئی برائیاں بھی اب ان پر آ پڑیں گی، یہ(ہمیں) ہرادینے والے نہیں''۔(محمد جوناگڑھی،وَالَّذِيْنَ ظَلَمُوا کا ترجمہ گناہ گار کرنا درست نہیں ہے)

''ان سے اگلے بھی ایسے ہی کہہ چکے تو ان کا کمایا ان کے کچھ کام نہ آیا،تو ان پر پڑ گئیں ان کی کمائیوں کی برائیاں اور وہ جو ان میں ظالم ہیں عنقریب ان پر پڑیں گی ان کی کمائیوں کی برائیاں اور وہ قابو سے نہیں نکل سکتے''۔(احمد رضا خان)

مولانا امانت اللہ اصلاحی کا خیال ہے کہ (وَالَّذِيْنَ ظَلَمُوا مِنْ هٰؤُلَاء) میں من تبعیض کا نہیں

بلکہ بیانیہ ہے، ''ان میں جنھوں نے ظلم کیا'' کی بجائے ترجمہ ہوگا ''اور یہ لوگ جنھوں نے ظلم کیا'' آیتوں کا ترجمہ ہوگا:

''ان سے پہلے والوں نے بھی یہ بات کہی تو ان کی کمائی ان کے کچھ کام آنے والی نہ بنی، پس ان کے اعمال کے برے نتائج ان کے سامنے آئے اور یہ لوگ جنھوں نے ظلم کیا، ان کے سامنے بھی ان کے اعمال کے برے نتائج جلد آکے رہیں گے۔ اور یہ ہمارے بس سے نہیں نکل سکتے''۔ (امانت اللہ اصلاحی)

(٦٧) فعل ماضی کا ترجمہ حال یا مستقبل سے

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ أَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَلَكَهُ يَنَابِيعَ فِي الْأَرْضِ ثُمَّ يُخْرِجُ بِهِ زَرْعاً مُّخْتَلِفاً أَلْوَانُهُ ثُمَّ يَهِيجُ فَتَرَاهُ مُصْفَرّاً ثُمَّ يَجْعَلُهُ حُطَاماً إِنَّ فِي ذَلِكَ لَذِكْرَى لِأُولِي الْأَلْبَابِ ۔ (الزمر:۲۱)

آیت مذکورہ میں پہلے دو افعال ماضی کے صیغے میں ہیں، جبکہ بعد کے تمام افعال مضارع کے صیغے میں ہیں، اس کی رعایت ترجمہ میں ہونا چاہئے تھی، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ بعض مترجمین نے اس فرق کی رعایت نہیں کی ہے، اور تمام افعال کا استمراری حال کا ترجمہ کیا ہے مندرجہ ذیل دو مثالیں ملاحظہ ہوں:

''کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ آسمان سے پانی اتارتا ہے اور اسے زمین کی سوتوں میں پہنچاتا ہے، پھر اسی کے ذریعہ سے مختلف قسم کی کھیتیاں اگاتا ہے پھر وہ خشک ہو جاتی ہیں اور آپ انہیں زرد رنگ دیکھتے ہیں پھر انہیں ریزہ ریزہ کر دیتا ہے، اس میں عقل مندوں کے لئے بہت زیادہ نصیحت ہے''۔ (محمد جونا گڑھی)

''دیکھتے نہیں کہ اللہ ہی اتارتا ہے آسمان سے پانی، پس اس کے چشمے جاری کر دیتا ہے زمین میں۔ پھر اس سے پیدا کرتا ہے کھیتیاں مختلف قسموں کی، پھر وہ خشک ہونے لگتی ہیں اور تم ان کو زرد دیکھتے ہو، پھر وہ ان کو ریزہ ریزہ کر دیتا ہے، بے شک اس کے اندر اہل عقل کے لئے بڑی یاددہانی ہے''۔ (امین احسن اصلاحی)

جبکہ مندرجہ ذیل ترجمہ میں صیغوں کے اس فرق کی پوری رعایت کی گئی ہے:

''کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے آسمان سے پانی برسایا، پھر اس کو سوتوں اور چشموں اور دریاؤں کی شکل میں زمین کے اندر جاری کیا، پھر اس پانی کے ذریعہ سے وہ طرح طرح کی کھیتیاں نکالتا ہے جن کی قسمیں مختلف ہیں، پھر وہ کھیتیاں پک کر سوکھ جاتی ہیں، پھر تم دیکھتے ہو کہ وہ زرد پڑ گئیں، پھر آخر کار اللہ اُن کو بھس بنا دیتا ہے درحقیقت اِس میں ایک سبق ہے عقل رکھنے والوں کے لیے" (سید مودودی)

یا اباالليث!

شبیر احمد فلاحی، نئی دہلی
موبائیل نمبر:08750368163

مولانا ابوالليث اصلاحیؒ مدرسۃ الاصلاح (سرائمیر، اعظم گڑھ) سے فراغت کے بعد ندوۃ العلماء (لکھنؤ) تشریف لے گئے۔ مدرسۃ الاصلاح میں عربی ادب، تفسیر وغیرہ کی جو ٹھوس تعلیم دی جاتی تھی اس میں کوئی ادارہ اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔ پھر عربی زبان وادب میں مزید نکھار پیدا کرنے کے لئے وہاں بھی داخلہ لے لیا۔ اس وقت مراکش کے مشہور عربی زبان کے متبحر عالم دین علامہ تقی الدین ہلالیؒ وہاں کے طلبہ کو عربی پڑھاتے تھے۔ مولانا مسعود عالم ندوی، مولانا ابوالحسن علیؒ ندوی اور مولانا ابوالليثؒ ہم سبق تھے، مولانا ابوالليث صاحب کا نام شیر محمد تھا۔ علامہ ہلالیؒ ہی نے آپ کو ابوالليث کا نام دیا تھا۔ یہ تینوں حضرات علامہ ہلالیؒ کے خاص شاگرد تھے۔ ان کے علمی چشمہ سے خوب سیراب ہوئے۔

تحریک اسلامی کی تشکیل کے بعد مولانا مودودی نے لدھیانہ میں دارالعروبۃ قائم کیا تاکہ عالم عرب میں تحریک کو متعارف کرایا جاسکے، جس نے تقسیم ہند سے قبل کافی کتابیں عربی میں منتقل کردی تھیں، اس میں پنجاب کے عاصم الحداد اور مولانا جلیل احسن ندوی مرحوم بھی کچھ عرصہ مشغول رہے، اس دارالعروبہ کے ذمہ دار مولانا مسعود عالم ندوی تھے۔ علامہ ہلالی کو اللہ تعالیٰ نے علم کی دولت اور شہرت کے ساتھ عمر دراز سے بھی نوازا تھا۔ ۱۲۰ رسال کی عمر میں اس دار فانی سے وہ رخصت ہوئے۔ ان کے ایک شاگرد ہونے کی بنا پر مولانا ابوالليثؒ بھی عربی زبان میں اپنے مافی الضمیر کا اظہار فرماتے اور عربی رسائل میں ان کے مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔ میں نے تو نہیں پڑھا استاذ محترم مولانا عبدالحسیب اصلاحی صاحب (سابق شیخ التفسیر جامعۃ الفلاح) نے دوران تدریس کئی بار ذکر فرمایا۔ مولانا علی میاںؒ کا تو عربی زبان میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رہا، عالم عرب میں بھی معروف ومشہور رہے اور ہیں، لیکن مولانا ابوالليثؒ اس محاذ پر زیادہ کام نہیں کرسکے۔ مولانا علی میاںؒ عمر کے آخری ایام تک اس محاذ پر لگے رہے۔ الرائد اور البعث الاسلامی میں آپ کی تحریریں شائع ہوتی رہیں۔ آپ کی عربی کتابیں عرب ممالک اور ہندوستان دونوں ہی

جگہ شائع ہوتی رہیں۔ مرکز جماعت میں ایک مرتبہ بہت سی عربی کتب بطور ہدیہ موصول ہوئیں، ایک کتاب کا عنوان تھا ''تاریخ الدعوۃ الاسلامیہ فی الھند''، راقم نے اس کو فوراً اٹھایا اور پڑھنا شروع کیا۔ اس کی فصیح و بلیغ، رواں اور سلیس زبان پر بڑی حیرت ہوئی۔ نیز یہ کہ ایک عرب ۴؍جلدوں میں ہندوستان کی تاریخ دعوت کیسے لکھ سکتا ہے، اور ہندوستانی ہے تو ایسی عربی کیسے لکھ سکتا ہے۔ پلٹ کر دیکھا تو مصنف مسعود عالم ندوی ہیں۔ مولانا ابواللیثؒ بھی ان دونوں حضرات کے ہم سبق ہیں۔

علامہ ہلالیؒ اپنے ان تینوں شاگردوں کو بہت یاد کرتے تھے۔ کیونکہ یہ تینوں حضرات ان کی نگاہ میں بہت ہی لائق و فائق اور ذہین تھے۔ بلکہ ایک موقع پر انہوں نے یہ بھی فرمایا تھا کہ ابو اللیث اذکی من علی، کہ ابواللیث علی میاں سے زیادہ ذہین ہیں۔ مسعود عالم ندویؒ کی ایک مشہور کتاب ہے ''ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک'' اس کا ترجمہ ایک صاحب نے عربی میں کیا ہے، مترجم نے پوری کتاب کا عربی ترجمہ علامہ ہلالیؒ کو سنایا، انہوں نے اس کو سنا تو اس کی تاریخی اور علمی حیثیت کا ان کو اندازہ ہوا۔ اپنے شاگرد کے اس کارنامہ پر بہت خوش ہوئے، مقدمہ بھی لکھا، اور ایک جملہ میں سب کچھ کہہ دیا، قد بھر اقرانہ یعنی وہ تو اپنے تمام ساتھیوں پر بازی لے گیا۔ انہیں کے انتقال پر مودودیؒ نے فرمایا تھا: ''میرا ایک بازو کٹ گیا''۔

مولانا ابواللیثؒ کے بعد جب مولانا محمد یوسف صاحب امیر جماعت منتخب ہوئے تو رابطہ عالم اسلامی کی کانفرنس میں جماعت کی طرف سے مولانا ابواللیث صاحب نے نمائندگی کی۔ وہاں پہنچ کر مولانا کو یہ جان کر بے حد مسرت ہوئی کہ ان کے استاذ محترم علامہ ہلالیؒ سے بھی ان کی ملاقات ہوگی۔ اس وقت وہ بھی سعودی عرب میں تھے۔ علامہ ہلالی کو مولانا کی وہاں آمد کی اطلاع ہوگئی تھی، وہ بھی بے قراری سے آپ کا انتظار کر رہے تھے۔ مولانا علی میاںؒ سے تو ملاقات ہوتی رہتی تھی لیکن ابواللیث صاحب سے ایک بار بھی نہیں ہوئی تھی۔ سابق امیر جماعت یوسف صاحب بھی علامہ ہلالی سے کئی بار ملاقات کر چکے تھے۔ مولانا ابواللیثؒ جب اپنے استاد سے ملے تو انہوں نے محبت و تکریم کے الفاظ سے خیر مقدم کرنا شروع کیا۔ ان کے ذہن میں تو اسی شاگرد کا تصور تھا جو عربی زبان پر عبور رکھتا تھا، لیکن مولانا اب ان کے سامنے اس معیار مطلوب پر نہیں اتر رہے تھے، وہ فوراً سمجھ گئے کہ عربی ماحول میں اپنے رفیق علی میاںؒ کی طرح ان کی زندگی نہیں گزری، اور وہاں کی اردو زبان ہی کے ماحول سے نکل کر آ رہے ہیں۔ مولانا سوچ سوچ کر الفاظ کا انتخاب کرتے ہوئے گفتگو فرما رہے تھے، لیکن استاذ محترم تو عربی دانی میں ان کے دور عروج کو یاد کر رہے تھے، اور اب اس زوال کو دیکھ کر پریشان ہوگئے۔ اسی وقت بے ساختہ فرمایا: یا ابا اللیث لعنة الله على الأردية۔ ارے ابواللیث! اردو زبان پر اللہ کی لعنت ہو، یعنی اس کی وجہ سے تم تو عربی زبان ہی بولنا بھول گئے۔

راقم مولانا ابواللیث اصلاحیؒ کے سامنے مرکز جماعت میں بیٹھا ہوا تھا۔ مجھ سے مخاطب ہو کر ہنستے

ہوئے انہوں نے یہ واقعہ سنایا۔ حقیقت میں یہ جملہ اپنے ایک شاگرد سے غایت درجہ محبت اور تعلق خاطر کا اظہار تھا۔ اسی لئے مولانا نے لطف اندوز ہوتے ہوئے بیان کیا۔ اس کا مطلب ہرگز نہیں کہ آپ عربی زبان میں خواہ قدماء کی کتب ہوں یا دور جدید کے اخبارات ورسائل ان کو سمجھنے میں دقت محسوس کرتے تھے۔ آپ نے ایک بڑے عربی ادیب اور مصنف شیخ محمد غزالیؒ کی ایک عربی کتاب کا اردو میں ترجمہ بھی کیا تھا۔ کسی لفظ کی تقدیم وتاخیر اور کمی وزیادتی کے بغیر اتنا سلیس اور رواں ترجمہ کہ حیرت ہوتی تھی۔ کہیں بھی دوبارہ قلم نہیں چلایا، ایسا لگتا تھا کہ اردو میں ہی یہ کتاب لکھی گئی ہے۔ اس واقعہ کو بیان کرنے کا مقصد آپؒ کا یہ تھا کہ جو نعمت اپنی محنت اور اللہ کے فضل کرم سے انسان کو ملے اس کو ضائع نہیں کرنا چاہئے، اور عربی مدارس کے فارغین کو عملی زندگی میں عربی زبان کو جاری وساری رکھنا چاہئے۔ کیونکہ اسی زبان میں ہمارا دینی سرمایہ محفوظ ہے۔ ترجمہ اصل کی جگہ ہرگز نہیں لے سکتا۔ مولانا کے استاذؒ اور خود مولاناؒ کا آنے والی نسلوں کے لئے اس ایک جملہ میں بہت بڑا پیغام بھی ہے اور غور وفکر کی دعوت بھی۔

اس کے برعکس مولانا محمد یوسف صاحب جن کی زبان اول یا مادری زبان انگریزی تھی، عربی سے انہیں جنون کی حد تک لگاؤ تھا۔ جماعت میں شامل ہوتے ہی عربی زبان سیکھنے پر پوری توجہ مرکوز کی۔ قرآن وحدیث کے الفاظ پر دقیق نظر ڈالتے تھے۔ ۱۹۷۰ء میں حج پر گئے۔ عرب علماء سے بحیثیت قیم جماعت ملاقاتیں کیں۔ جماعت کا تعارف کرایا۔ کیونکہ وہاں تحریک اسلامی کا نمائندہ کسی اور صاحب کو سمجھا جاتا تھا۔ آپ نے تحریک اسلامی ہند کی صحیح تصویر پیش کی اور اس کی سرگرمیوں سے ان لوگوں کو متعارف کرایا۔

وہاں پہنچنے کے بعد بول چال کی عربی کا علم ہوا تو بہت حیرت ہوئی۔ الی لغة القرآن من جدید کے عنوان سے ایک مختصر مضمون لکھا جو ایک جریدہ میں شائع ہوا۔ امیر جماعت منتخب ہونے کے بعد عربی زبان پر مزید توجہ دی۔ اپنے مدعا کو آسان عربی زبان میں پیش کرنے کا انہیں ملکہ حاصل تھا۔

امارت کے منصب پر فائز ہونے کے بعد مرکز سے قریب کی مسجد میں ایک پروگرام شروع کرایا۔ وہ یہ تھا کہ کوئی مختصر سی حدیث کا عربی متن مصلیوں کو عصر کی نماز کے بعد سنایا جائے اور اس کا ترجمہ پیش کردیا جائے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ لوگ عربی زبان سے مانوس ہوسکیں، اس نہج پر یہ سلسلہ عرصہ تک چلا بھی۔ لیکن اب تو مزاج یہ بن رہا ہے تیسری سیڑھی پر آپ بیٹھے ہیں تو دو سیڑھیاں چڑھنے کی زحمت کرکے میں آپ کے پاس بیٹھنا نہیں چاہتا، میری خواہش یہ ہوتی ہے کہ آپ خود نیچے اتر آیئے۔ مجھے زحمت نہ دیجئے۔ اس کو علمی تساہل اور تکاسل کہتے ہیں جو قوم، ملت، جماعت اور تحریک اس کا شکار ہوئی وہ زوال کی راہ پر گامزن ہوگئی۔

●●

پھر چھیڑا 'روایات' نے اپنا قصّہ!

ڈاکٹر امتیاز وحید، شعبہ اردو، کروری مل کالج، دہلی یونیورسٹی،
موبائیل نمبر: 07827925836، ای میل: ijnuwaheed@gmail.co

حضرت دل کی طرح جامعۃ الفلاح کی تفسیریں بھی برابر لکھی جایا کریں گی۔ یہ احساس گمانِ غالب اور پھر یقینِ کامل میں تبدیل ہو جاتا ہے جب مدارس کے تعلق سے علماء کی یہ بات کانوں میں گونجتی ہے کہ ''مدارسِ اسلامیہ دین کے مضبوط قلعے ہیں''۔ اس تناظر میں، میں مادرِ علمی 'فلاح' کے تعلق سے خود کو اس کے علمی، تاریخی، تحریکی، تہذیبی، دینی اور معاشرتی روایات کے قوسِ قزح میں دیکھنے کا خوگر پاتا ہوں، کیونکہ روایات اقدارِ حیات کا حصہ ہیں، جو قوموں کی زندگی اور ان کے عروج و زوال سے تحریک پاتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ زندہ قومیں اپنے اسلاف اور بزرگوں کی روایتوں کی امین ہوتی ہیں۔ انھیں نہ صرف زندہ رکھتی ہیں بلکہ نسلِ نو کی طرح ان کی پرورش و پرداخت کا نظم بھی کرتی ہیں۔ پھر اس کا سلسلہ نسل در نسل چل نکلتا ہے۔ یہاں تک کہ یہ روایتیں متعلقہ معاشرت کا شناخت نامہ بن جاتی ہیں۔ اچھی اور صحت مند روایتیں عموماً روزمرہ کی عادت میں اس طرح داخل ہو جاتی ہیں کہ ہم غیر محسوس طور پر خود کو ان کی انجام دہی کے لیے آمادہ پاتے ہیں۔ بعینہٖ یہی صورت اس وقت الٹی پڑ جاتی ہے جب ان کا تعلق شر سے ہوتا ہے۔ مذموم روایتیں بھی فطرت ثانیہ بن جاتی ہیں، جن سے پیچھا چھڑا پانا آسان نہیں ہوتا۔ کہنہ پرستی کی مذموم روایت سے اقبال کی بیزاری ملاحظہ کیجیے۔ ع

ملتِ رومیؒ نژاد کہنہ پرستی سے پیر

جامعۃ الفلاح کی جن روشن روایات کے ضمن میں یہ تمہیدی باتیں کہی گئیں، ان میں سے ایک کا تعلق روزمرہ کی سماجی اور اخلاقی زندگی سے ہے جبکہ دوسری روایتیں وہاں کے تعلیمی اور تدریسی نظام سے متعلق ہیں، جو طلبہ کی نشست و برخواست میں خود اعتمادی اور بلند کرداری کی صورت میں ظاہر ہوتی ہیں۔ ان پاکیزہ روایات کی خوشبو فلاح کے گوشے گوشے میں پھیلی ہوئی ہے۔ ع

اے کہ ذروں میں ترے بوئے یقیں، ذوقِ سجود

جامعۃ الفلاح کے معاشرتی اور اخلاقی شعبے کی روشن روایتوں میں مہمانوں کو اولیت کا مقام حاصل ہے۔ ہمارے زمانے میں جب فلاح کے حدود میں داخلے کے لیے آج کی طرح بلند و بالا 'باب الداخلہ' اور آہنی گیٹ نہیں تھے اور بظاہر باہر سے آنے والے کسی مہمان پر اثر انداز ہونا ممکن نہیں تھا بلکہ بسا اوقات تو یہ احساس دامن گیر ہوتا تھا کہ آنے والا ہمارے درو دیوار کو دیکھ کر کیا تأثر قائم کرے گا، ایسے وقت میں ہم اپنی مثالی روایت سے مہمان کے دل میں گھر بنا لیتے تھے۔ روایت یہ تھی کہ کسی بھی طالب علم کو گیٹ پر کوئی مہمان نظر آیا تو وہ وہیں سے ان کے استقبال کے لیے دوڑ پڑتا تھا۔ مہمان خواہ پسند نہ کریں لیکن طلبہ ان کے ہاتھ سے ان کا سارا سامان لے لیتے اور انھیں مہمان خانے تک لے جاتے تھے۔ بعد میں ان کے متعلقین کو اطلاع دی جاتی تھی۔

فلاح میں مختلف شعبہ ہائے حیات سے منسلک بڑی شخصیات کی آمد و رفت کا سلسلہ لگا رہتا تھا۔ ذی علم مہمانوں کے اعزاز میں مسجد میں پروگرام کا انعقاد کیا جاتا تھا، جہاں عام طلبہ انھیں بغور سنتے اور نوٹ بھی لیا کرتے تھے۔ مولانا وحید الدین خان صاحب کو پہلی بار ہم نے وہیں دیکھا، گلاس کے پانی کو چائے کی طرح احتیاط سے پیتے ہوئے طلبہ سے مخاطب تھے۔ ان کی فکری باتیں تو اس وقت کیا سمجھ میں آتیں البتہ اتنی بات یاد رہ گئی جو انھوں نے نوجوان طلبہ کی تربیت کے لیے کہی تھی کہ امریکہ دورے کے درمیان ایک پروگرام میں ایک نوجوان امریکی دوشیزہ میرے سامنے دوزانو بیٹھ گئی اور مجھ سے پوچھا کہ آپ مسلم نوجوانوں سے کیوں نہیں کہتے کہ چار شادیاں کریں جبکہ اسلام میں اس کی اجازت دی گئی ہے۔ ہم کہاں جائیں اور کس سے یہ ماجرا سنائیں۔

بچوں کے ادیب جناب مائل خیرآبادی کو مسجد میں ممبر کے پاس کھڑے ہو کر بچوں سے باتیں کرتے سنا۔ ایس آئی او آف انڈیا کے کل ہند صدر جناب پی سی حمزہ نے بھی مسجد میں طلبہ سے انگریزی زبان میں خطاب کیا، جس کی ترجمانی برادرِ محترم مرحوم طارق فارقلیط فلاحی صاحب نے کی تھی۔ جناب عزیز بگھروی نے ''گاہے گاہے چھوڑ جاؤ اپنی یادوں کے نقوش / آندھیاں اب کے برس تم شہر کے اند چلو' والی غزل سنائی اور طلبہ نے ان کے سامنے ان کا مشہور زمانہ ترانہ ''ہم دینِ محمد کے وفادار سپاہی...... مرجائیں گے ایمان کا سودا نہ کریں' پیش کیا۔ جناب حفیظ میرٹھی صاحب نسواں میں زیرِ تعلیم اپنی بیٹی سے ملنے یا انھیں چھٹیوں میں لینے آتے تو مودودی ہاسٹل کے ہال میں ان کے اعزاز میں شعری نشست کا اہتمام ہوتا تھا۔ ہم نے ان کی مقبول غزل

جب سب کے لب سِل جائیں گے ہاتھوں سے قلم چھن جائیں گے
باطل سے لوہا لینے کا اعلان کریں گی زنجیریں

ان کی زبانی سنی، جسے وہ اپنے مخصوص انداز میں جھوم جھوم کر سناتے تھے۔

جامعہ کے ذی وقار مہمانوں سے طلبہ کے سامنے زندگی کے کئی پہلو اجاگر ہوتے، جس کا اثر کہیں نہ کہیں طلبہ کی طبیعت اور ذوق پر پڑتا تھا۔ بچپن کا یہی علمی اور تربیتی ماحول فرد کی شخصیت سازی کا محرک بنتا ہے اور بچہ اپنے ذوق اور دلچسپی کے شعبہ کا رخ متعین کرتا ہے۔ فلاح میں یہ روایت بڑی مستحکم تھی۔

ہندستان کے مدارس میں استاد اور شاگرد کے مقدس رشتے کی آڑ میں جو قباحتیں پنپتی ہیں، ان کے پیشِ نظر ہم نے جامعۃ الفلاح کا مزاج جداگانہ ہی پایا۔ طلبہ اور اساتذہ میں یہاں بھی گہرا ربط پایا جاتا ہے بلکہ بسا اوقات یہ پدرانہ تعلق سے آگے بڑی حد تک برادرانہ اور اس سے آگے بڑھ کر دوستانہ نوعیت کا بھی ہو جاتا ہے۔ اس کے باوجود ہم نے کسی استاذ کو شاگردی کے نام پر کسی طالب علم سے کوئی ذاتی کام لیتے نہیں دیکھا۔ ہمارے زمانے میں اساتذہ اپنا سارا کام خود انجام دیتے تھے۔ حتیٰ کہ وہ اپنے ہاتھوں سے وضو کا پانی لانے کی جدوجہد کرتے بھی دکھائی دیتے، جہاں عموماً طلبہ خود آگے بڑھ کر ان کے ہاتھ سے پانی کا لوٹا لے لیتے اور انھیں اس زحمت سے بچانے کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ جامعۃ الفلاح میں اساتذہ کے لیے طلبہ سے تعلقات کی حدیں آئینی طور پر متعین کردی گئی ہیں یا تحریکیت کے سبب اساتذہ اخلاقاً خود اپنا ذاتی کام کرنے کے خوگر ہیں، معلوم نہیں۔ لیکن ہمیں فلاح کا یہ امتیاز بڑا بھایا کیونکہ ہم ایسے مدرسوں سے ہوکر گزرے تھے، جہاں پیر دبوائے بغیر ہمارے فاضل اساتذہ کو نیند ہی نہیں آتی تھی۔ جامعۃ الفلاح میں طلبہ کی عزتِ نفس کو جو مقام حاصل ہے اس کے سبب وہاں کے نظام میں شاگرد اور استاذ کے درمیان آپسی احترام کا ایک واضح تصور پایا جاتا ہے، جس سے دونوں واقف ہیں۔

طعام و شرب کے باب میں فلاح نے عدل کی مثالی راویت کو اپنا شیوہ بنا رکھا ہے۔ استاذ اور شاگرد دونوں ایک جیسا کھانا کھاتے تھے۔ اس سے براہِ راست طلبہ کی نفسیات پر گہرا اثر پڑتا تھا۔ لہٰذا ہمارے زمانے میں طلبہ اور اساتذہ کے مابین کسی تفریق کو کبھی دراندازی کا موقع نہیں مل پایا۔ البتہ مطبخ کی بجائے اساتذہ کا کھانا ان کے حجروں میں پہنچا دیا جاتا تھا۔ اس سے فلاح میں کھانے کے معیار کا عقدہ بھی کھلتا ہے۔

سلام کی اسلامی روایت سے یوں تو ہر مسلمان قلبی تعلق رکھتا ہے، مگر فلاح کے دینی ماحول میں اس پاکیزہ وصف کو جس خوبی سے پنپنے اور فروغ پانے کا موقع ہاتھ آیا، وہ ہمارے زمانے میں جامعۃ الفلاح کا ایک نمایاں وصف تھا۔ اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے کسی سے ملاقات خواہ لمحہ بھر کی ہی کیوں نہ ہو، مبدأ اور منتہی ایک دوسرے پر سلامتی کا جذبہ ہوا کرتا تھا۔ ہم اس ماحول میں ایسے گھل مل گئے تھے کہ کسی سے ملاقات ایک دیوار کی آڑ کے بعد بھی ہو، تو ہمارا تحت الشعور فوراً متحرک ہو جاتا تھا، اور زبان سے مافی الضمیر کا اظہار سلام کی صورت میں ہو جایا کرتا تھا۔ مصافحہ اور نئے ملاقاتی سے اپنا نام بتا کر خود کو متعارف کرانے کے خوگر بھی ہم وہیں ہوئے۔ یہ عادت علی گڑھ پہنچ کر اور زیادہ صیقل ہوئی۔ علی گڑھ میں سلام

میں پہل کرنے کی روایت نے اس قدر ترقی کی کہ ''وعلیکم السلام'' کا اسلامی طریقہ کہیں راہ ہی میں کھو گیا۔ سلام کا جواب وہاں سلام ہی سے دیا جاتا ہے اور اس کی خوبصورت توجیہ بھی پیش کی جاتی ہے۔

اقامت گاہوں میں کمرے کی صفائی ستھرائی کی ذمہ داری ہمارے زمانے میں اس کے مکینوں کی تھی۔ ہم مثالی بورڈنگ کے کئی کمروں میں مقیم رہے اور نظافت کے اس خودکار نظام اور اس کی دیرینہ روایت کے امین بنے رہے۔ مودودی ہاسٹل سے متصل مثالی بورڈنگ کے جس کمرہ نمبر ۲۶ رمیں ہم مقیم تھے اس میں ہم نے صفائی کے نظام کو خاصا آئینی اصول وضوابط پر استوار کر رکھا تھا۔ قاعدہ یہ تھا کہ کمرے کے کسی ممبر کو اگر صبح آٹھ بجے تک صفائی کا خیال نہ آتا اور وہ متعینہ وقت میں صفائی نہیں کر پاتا تو سزا کے طور پر اس پر ایک دن کی صفائی کی اضافی ذمے داری عاید ہو جاتی تھی۔ یاد آتا ہے ہمارے جونیر بھائی جناب عتیق فلاحی (چھندواڑہ) کو جیسے ہمارے اس آئینی شق کی زد میں آنے کا چسکا لگ چکا تھا کہ بعد میں ہمیں خود یہ فکرمندی لاحق ہونے لگی کہ انھیں کسی طرح اس لذتِ آزار سے نجات دلائیں۔ لیکن وہ بھی ایسے پختہ کار مومن نکلے، جو ایک ہی دفعہ (Article) سے بار بار زیر بار ہونے میں راحت محسوس کرتے تھے۔ متعینہ وقت کے گزرتے ہی احباب میں فتح مندی کی ایک لہر دوڑ جاتی جس کا جشن ہم عموماً ہاؤ ہو اور ہنگامہ برپا کر کے کرتے تھے۔ تعزیراتِ حجرہ کی دفعہ 'طہارت مندی' کی زد میں نہ آنے اور اپنی باری کو یاد رکھنے کی سبھوں نے اپنے طور پر کوئی نہ کوئی ترکیب نکال رکھی تھی۔ اس کے باوجود ع 'چُوک' سے کس کو رُستگاری ہے / آج اس کی کل ہماری باری ہے۔

غافلوں کا یہ عقیدہ بالکل درست ہے کہ ''ہر شخص کو 'غفلت' کا مزہ چکھنا ہے''۔ یاد آتا ہے کہ ہمارے کمرے کا کوئی بڑے سے بڑا ابوعیار بھی اس کی زد سے محفوظ نہیں رہ پایا ہوگا۔ اِلّا ماشاءاللہ۔ مقام شکر ہے کہ 'الطہارۃ نصف الایمان' کے کلیے کا بھرم ہمارے عہد کے فلاح میں پوری طرح قائم تھا۔ مبتلا ہونے کے لیے نہ ہیضہ تھا اور نہ حضرتِ خارش! نظافت پر ہمارے نصف ایمان کے علاوہ انھیں غالباً حکیم جی کے مطب سے ہمارے گہرے رشتے کا بھی علم تھا۔

فلاح میں شعبۂ باغبانی کے تحت فلاح کی چہار دیواری میں ہریالی کو یقینی بنانا، پیڑ پودوں کی نگہداشت، لان میں پودوں کی آب پاشی، مدرسے کے احاطے میں گزرگاہوں کے کنارے خوشنما پودوں اور پھولوں کی کیاریاں بنانے اور اینٹوں کو مثلث نما بنا کر انھیں سجانے کی خوبصورت روایت ممکن ہے اب بھی باقی ہو۔ ہمارے زمانہ طالب علمی میں اس شعبے میں اس وقت نکھار آیا جب بی ڈی اُو کی حیثیت سے بلریا گنج کے بلاک میں جناب محمد ایوب صاحب ساکن، سیک مقام علی نے چارج سنبھالا۔ وہ صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے۔ شرعی داڑھی کے ساتھ شیروانی کرتا اور پائجامہ زیب تن کیا کرتے تھے۔ برسات کے موسم میں انھوں نے پیڑ پودوں سے بھرا ایک ٹرک فلاح میں بھجوایا۔ ان کی یہ

عنایت اس وقت ہمارے لیے نعمت غیر مترقبہ تھی۔ کدال اور کھرپی لے کر تمام طلبہ نے فلاح کے کیمپس کو پیڑ پودوں سے پاٹ دیا۔ ہمیں اس بات کی خوشی تھی کہ ہم آیندہ نسلوں کے لیے کارِخیر کرتے جا رہے ہیں۔ اس طرح شجر کاری کی توانا روایت کو ہم نے بڑے تزک و احتشام کے ساتھ فلاح کے نظام میں جاگزیں کیا اور باغبانی کے امور کو متمول بنایا۔

نمازِ عصر کے بعد فلاح کی مسجد میں گمشدہ اشیاء کے اعلان کی روایت بھی وہاں کے نظام کی صحت مندی کہی جا سکتی ہے۔ ہمارے زمانے میں جس کسی طالب علم کو چھوٹی یا بڑی کسی کی کوئی چیز پڑی ملتی تو وہ اسے مولانا صغیر احسن اصلاحی صاحب کے پاس جمع کروا دیتا تھا۔ مولانا مرحوم کا یہ وطیرہ تھا کہ وہ نماز بعد کھڑے ہوتے اور لاوارث یا گمشدہ اشیاء سے حاضرین کو مطلع کرتے تھے۔ کبھی کبھی مولانا حسبِ ضرورت بعض تذکیری، تنبیہی اور تاکیدی باتیں بھی کرتے تھے۔ انداز ہمیشہ ایک جیسا، حشو و زائد سے پاک ایک سانچے میں ڈھلا ہوا ہوتا تھا۔ اکثر ان کی باتوں کا تعلق طلبہ کی کوئی کوتاہی، دیر سے کھیلتے رہنے کے سبب نماز میں تاخیر، کوئی بے راہ روی یا کوئی اور وقتی مسئلہ ہوتا تھا۔ مولانا مرحوم کے بعد معلوم نہیں تنبیہ الغافلین کا یہ فریضہ کس کے ذمے ہے۔

فلاح میں ششماہی اور سالانہ امتحان کے بعد تعطیل کا موسم آتا تو جامعہ کی کشادہ مسجد میں سفر پر روانہ ہونے سے پہلے 'توشۂ سفر' تقسیم کرنے کی مستحکم روایت تھی۔ یہ روایت ہر سال ہمارے زمانے کے مہتمم جامعہ مولانا عبدالحسیب اصلاحی صاحب کی زبانی تازہ کی جاتی تھی۔ مولانا اپنے مخصوص لہجے میں مخاطب ہوتے اور ''عزیز طلبہ'' کے بعد آدابِ سفر سے متعلق بنیادی باتیں بتاتے تھے، جن کا سیاق دینی اور اسلامی ہوتا تھا۔ امیر سفر منتخب کرنے کی فضیلت و معنویت، امیر سفر کی اطاعت، افراد اور سامان کی تعداد سے آگہی، راستے میں ٹرین پر کسی کے ہاتھ سے کچھ نہ لینا اور ہوشیاری سے سفر کرنا، جھگڑے اور فساد سے پرہیز، سفر کی دعا اور دیگر امور پر مختصراً خطاب فرماتے اور اخیر میں فی امان اللہ کہا جاتا تھا۔ لوگ مصافحہ اور حسبِ توفیق معانقہ کرتے اور جدا ہو جاتے تھے۔

فلاح کی اقامتی معاشرت کا ایک پرلطف منظر موسم برسات میں دیکھنے کو آتا تھا۔ تقریب فہم کے لیے اسے ''یوم باراں کی روایت'' سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔ برسات کے موسم میں ہماری شدید خواہش ہوتی تھی کہ اللہ کسی صورت بارش کی ساعت اپنے فضل و کرم کے طفیل اس وقت تک طویل کر دے کہ اربابِ حل وعقد ہماری چھٹی کو لازم گردان لیں۔ من جانب اللہ یہ لطف و عنایت ہم پر تقریباً ہر سال ہی رہی۔ ہمارا زمانہ استاذ گرامی قدر مولانا عبدالحسیب اصلاحی صاحب کی صدارت کا تھا۔ وہ یوں بھی رقیق القلب ہیں۔ طلبہ کی بے بسی اور پرزور اپیل جو تقریباً ہر ایک اقامتی حجرے سے یکساں طور پر آتی تھی، اسے مولانا محترم ہماری ضمیر کی آواز سمجھ کر بارہا تعطیل کا فیصلہ لیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ جب شدید بارش نے معاً عین موقع پر سادہ لوحی

اختیار کرلی، تو انجام کار ہماری یہ اجتماعی اپیل بھی بے اثر ہونے لگی۔ ایسے آڑے وقت میں برادرم رئیس (چپراسی) نے اپنے اختیارِ خاص کا استعمال کرتے ہوئے چھٹی کے لیے گھنٹہ بجا دیا۔ ظاہر ہے کہ انتظامیہ کا عتاب تو اس کے حصے میں ضرور آیا ہوگا۔ مگر رئیس کی اس عنایت خاص کی لذت آج بھی محسوس ہوتی ہے۔

تعلیمی سرگرمیوں سے متعلق جو روایتیں فلاح کی زندگی کا حصہ تھیں، ان میں کلاس روم میں پڑھائے جانے والے اسباق کا قبل از وقت مطالعہ اور طلبہ کے لیے اپنی سطح پر اس کی تفہیم کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ مطالعے کی روایت وہاں کے تعلیمی نظام کا حسن ہے۔ ہمارے زمانے میں بغیر مطالعے کے کلاس میں آنا تعلیمی اخلاقیات کے منافی بلکہ جرم سمجھا جاتا تھا۔ یہ استاذ اور طالب علم دونوں پر لازم تھا۔ اس کی معنویت ہمارے اساتذہ یوں اجاگر کرتے تھے کہ بغیر مطالعہ کے کلاس میں آنے والوں پر اس دن کھانا جائز نہیں ہے۔ وہ طالب علم جو کسی مضمون کا قبل از وقت مطالعہ کیے بغیر کلاس میں آتا، نظریں چھپائے پھرتا تھا مبادا کہ کہیں کسی کو معلوم نہ ہو جائے؛ اس احتیاط کے باوجود اگر استاذ کچھ پوچھ بیٹھتے تو وہ بلا تأمل معذرت کا اظہار کر لیتا اور معتوب ہوتا تھا۔ ہمارے استاذ مولانا مرتضٰی فلاحی صاحب اس روایت کے صفِ اول کے موید اور علم برداروں میں سے تھے۔ فلاح کی تعلیمی بھٹی میں تپ کر کندن بنے تھے اور ہمیں صیقل کرنے کے فرائض پر مأمور تھے۔ ۱۹۸۶ میں جب ہماری ان سے ملاقات ہوئی تو ''بابو مطالعہ'' ان کا تکیہ کلام بن چکا تھا۔ یہ فلاح کی روشن روایت ہی تھی، جس کا وردان کی زبان پر کلمۂ حق کی طرح جاری تھا۔ یہ روایت ان کی نفسیات کے راستے ہماری نفسیات کا حصہ بن گئی۔ کلاس میں داخل ہوتے ہی ہم خود سے اور دوسرے ساتھیوں سے ''بابو مطالعہ'' کا استفہامیہ انداز اپنا لیتے۔ غالباً فلاح کی اس روشن روایت سے ملک کے معاصر اداروں کی آنکھیں بے نور ہیں۔ اس کا نتیجہ ہے کہ اس نظام کا پروردہ تاعمر مطالعے کا خوگر ہو جاتا ہے۔ فلاح کے روز و شب سے شغف رکھنے والوں کو علم ہوگا کہ فلاح نے تعلیم و تربیت کے سیاق میں ہمیشہ ''نہجِ تعلیم'' سکھانے کی بات کی ہے۔ فلاح میں اس بات کی کوشش ہوتی ہے کہ طالب علم کو وہ طریقِ تعلیم (Educational Method) بتا دیے جائیں، جن کے سہارے وہ علم و آگہی کا خوگر ہو جائے اور خود ڈکشنری اور لغات کی مدد سے زیادہ سے زیادہ علم حاصل کر سکے۔ مطالعے کی عادت نے وہاں کے متعلقین کو بڑا فیضیاب کیا۔ ہمارے بہت سے احباب نے محض اپنے نجی مطالعے کی عادت سے فائدہ اٹھا کر بہت سی پرائیویٹ اسناد حاصل کیں اور بڑی کامیابیوں کے حق دار بنے۔ فلاح کے اساتذہ ہی کو دیکھیں تو حیرت ہوتی ہے کہ ہماری نظروں کے سامنے کس طرح میرے نگراں اور مربی مرحوم ماسٹر ارشد صاحب نے حصولِ علم کی جدوجہد کی اور خود کو اتنا صیقل کیا کہ شبلی کالج میں لکچرر ہو گئے۔ ماسٹر شہنواز صاحب کو فلاح کی اسی روایت سے فیض پہنچا۔ مولانا تابش مہدی صاحب کو وہیں سے اعلیٰ تعلیم کی تحریک ملی اور وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ سے پی ایچ ڈی کر گزرے۔ یہ قدر و منزلت صرف فلاح کے مطالعے کی دین ہے۔

قبل از وقت مطالعے سے جو خود اعتمادی آتی ہے، اس کا نظارہ عموماً فلاح کے کلاس روم میں دیکھنے کو ملتا تھا۔ ایک ایک حرف پر بحث ہوتی تھی۔ ہر چہار جانب سے سوالات قائم کیے جاتے تھے۔ صرفی اور نحوی گتھیاں سلجھائی جاتی تھیں۔ لفظ کے سیاق وسباق اور مزاج پر گفتگو ہوتی تھی اور ذہن وفکر کے دریچے کھولے جاتے تھے۔ استاذ سے صحتمند بحث کا نظارہ دیدنی ہوا کرتا تھا۔ فلاح کا اصل مقصد محض کسی کتاب کی ورق گردانی نہیں، نہ ہی یہ کہ امسال فلاں شریف ختم کر دی گئی ہے بلکہ طلبہ کو وہ طریقہ سکھانا ہے جس سے وہ جس کتاب کو چاہیں اپنے طور پر پڑھ کر سمجھ لیں۔

تذکیر ہمارے زمانے میں فلاح میں درس وتدریس کی تمہید یا ابتدائیہ تھی۔ تمام طلبہ کا کلاس روم سے قبل تذکیر میں حاضر ہونا ضروری تھا۔ اس روایت کی شروعات بھی ہمارے زمانے میں ہی ہوئی تھی۔ طلبہ قطاروں میں کھڑے ہو جاتے تھے۔ تذکیر کی ذمہ داری کسی نہ کسی استاذ پر ہی ہوتی تھی۔ اسلامی آداب یا اعتقاد کا کوئی روشن پہلو پیش کیا جاتا تھا۔ اس کا محرک اصلاح ہوا کرتا تھا۔ ذہنی وفکری تربیت بھی اس کا ایک ہدف تھا۔ علماء حضرات کے طویل وعظ ونصائح کے بالمقابل یہ نہایت مختصر ترین کیپسول تھی، جسے ہماری ہمہ جہت تنومندی کے لیے اس وقت ناگزیر خیال کیا گیا تھا۔ بعض دفعہ ہمارے چند سینئروں کو بھی یہ اعزاز بخشا گیا کہ وہ بھی اس کارِ خیر میں حصہ لیں۔ سنا ہے آج کل فلاح میں تذکیر کی جگہ کسی ترانے نے لے لی ہے۔ خیر سے وہ پاکیزہ روایت کسی صورت میں اب بھی زندہ ہے۔

فجر کی نماز کے بعد کلام اللہ کی تلاوت ایک ایسی زرّیں روایت ہے جو بلا استثناء ہندستان بلکہ تمام عالم کے مدارس کا طرۂ امتیاز ہے۔ جامعۃ الفلاح میں یہ روایت ہمارے زمانے میں وہاں کے مزاج میں ایسی رچ بس گئی تھی کہ بلا ناغہ یہ سبھی طالب علم کا یومیہ وظیفہ تھی۔ صبح کی ٹھنڈی ہوا میں آیاتِ قرآنی کی غنائی صدا ہر سو سنائی دیتی تھی۔ ویسے تو قرآنی آیات میں بذاتِ خود ابدی نغمگی پائی جاتی ہے، جو اس کے سامع کو عجیب کیفیت میں مبتلا کر دیتی ہے مگر فلاح کے مخصوص دینی ماحول میں صبح کی سحر خیزی میں ملکوتی سُکر کی کیفیت پائی جاتی تھی۔ سوچتا ہوں کہ ایسا کیوں نہ ہو جبکہ وہاں طلبہ اور اساتذہ کی وہ بہترین جماعت موجود ہے، جو سوادِ اعظم مسلم اکثریت کے علی الرغم ''ورتّل القرآن ترتیلاً'' کے مفہوم سے آشنا ہے۔

۱۹۸۶ میں تابش مہدی صاحب کی فلاح آمد سے تلاوت قرآن کی روایت کو فنی بنیادیں حاصل ہوئیں۔ فن تجوید وقرأت کے پیشوا کی حیثیت سے تابش صاحب نے کچھ ایسا نظام قائم کیا کہ پوری طلبہ برادری اس رنگ میں رنگتی چلی گئی۔ حلقے بنائے گئے، جن میں تلاوت اور مخارج کی باریکیاں سکھائی گئیں۔ مشق وممارست اور عملی ریاضت کام آئی اور فلاح میں یہ شعبہ خاصا برگ وبار لایا۔ بلکہ قرآن کو اس کے درست مخارج، اصول اور پورے فنی آداب کے ساتھ پڑھنے کے اس ہنر نے بھی فلاح میں تلاوت قرآن کی طرح روایت کی شکل اختیار کر لی۔ ہمارا پورا عہد اس چشمۂ شافی سے فیض یاب ہوا۔ ممکن ہے اس کا فیض آج بھی جاری ہو۔

جامعۃ الفلاح نے اپنے تعلیمی ڈھانچے کو ایک خود کار نظام کی صورت میں تشکیل دیا ہے۔ درس وتدریس کا پُر اعتماد نظام، جس میں طلبہ اور اساتذہ کے بیچ کسی ثالث کی قطعی گنجایش باقی نہیں رہتی۔ ٹیوشن کی لعنت سے یکسر پاک ماحول۔ ان دنوں علمی معاونت کے خواہاں طلبہ کی ضرورتوں کی تکمیل ہمارے باصفا سینئر حضرات کے ہاتھوں ہوتی تھی۔ طلبہ عموماً عصر بعد اپنے سینئر احباب سے فیض اٹھاتے تھے۔ ایسا ممکن نہیں تھا کہ کسی نے کسی ضرورت مند طالب علم کو علمی تعاون دینے سے کبھی انکار کیا ہو بلکہ معاملہ اس کے برعکس تھا۔ ہمارے بعض سینئر احباب تو برضا ورغبت ہر آن اپنی خدمات دینے کے درپے رہتے تھے۔ انگریزی قواعد کی شد بد مجھے میرے پیرو مرشد جناب شاد اعظم فلاحی کے طفیل حاصل ہوئی۔ میری ابتدائی تعلیمی رہنمائی میں ان کا بڑا ہاتھ ہے۔ میرے حق میں ان کا کردار ہمیشہ ایک مشفق مربی کا رہا، جس کی حکایت مدرسے کی چہار دیواری سے سفیان کی پوری تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس طرح ہر ایک سینئر کی حیثیت ثقہ ہوتی تھی۔ ان کی فراغت کے بعد ہم جناب منظر بھائی کے حلقۂ تحفظات میں آ گئے اور انگریزی کی نصابی کتابوں کے بعض اسباق ان سے بھی پڑھے۔

فلاح سے عالمیت کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی گئے تو وہاں سینیارٹی (Seniority) کے بڑے بڑے لات ومنات دیکھے، مگر فلاح والی وہ بات کہاں! فلاح میں سینئر نو وارد طلبہ کے حوصلوں کا نقیب ہوتا تھا جبکہ علی گڑھ میں داخلہ لیتے ہی ماحول کے جبر سے طبیعت سینئر شکنی کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔

یہ تحریر کرتے ہوئے مسرت ہوتی ہے کہ کلاس کے علاوہ ضرورت مند طلبہ کی علمی رہنمائی کے لیے ہمارے اساتذہ بھی متحرک دیکھے گئے۔ جمعہ کے دن مرحوم ماسٹر زین العابدین صاحب بلا معاوضہ انگریزی زبان سیکھنے کے خواہش مند طلبہ کی جماعت کو لے کر قبرستان سے متصل ایک چھوٹے سے آم کے باغ میں بلیک بورڈ پر انگریزی پڑھانے جایا کرتے تھے۔ ہفتے کے ایک دن کی فرصت کو طلبہ کے لیے قربان کرنا اور وہ بھی ضعیف العمری میں، معمولی بات نہیں تھی۔ ماسٹر صاحب ریٹائرمنٹ کے بعد فلاح آئے تھے مگر ان کا حوصلہ غیر معمولی طور پر پُر جوش اور تازہ دم تھا۔ مولانا اسمٰعیل فلاحی صاحب عربی اول تا چہارم کے کمزور طلبہ کو پڑھاتے تھے، ماسٹر عبدالمالک صاحب بھی ہمارے زمانے میں اس کارِ خیر میں پیش پیش رہے۔ ہمارے اساتذہ کی یہ اضافی محنت مالی منفعت سے بالاتر محض فی سبیل اللہ تھی۔

مدارس میں تکرار، اجتماعی مطالعہ یا مباحثے کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یہ جامعۃ الفلاح کے نظام کا لازمی عنصر نہیں ہے البتہ عمومی حیثیت سے یہ روایت بذاتِ خود طلبہ کی تعلیمی ضرورت کی پیداوار ہے۔ بعض مدرسوں میں یہ وہاں کی تعلیمی کارگزاریوں کا جز ولاینفک ہے، جہاں کلاس ختم ہوتے ہی استاذ کسی ایک طالب علم کو 'تکرار' کی ذمے داری تفویض کر دیتا ہے، جسے وہ اپنی جماعت کے سبھی ساتھیوں

کے ساتھ انجام دیتا ہے۔یہ روایت فلاح میں عموماً امتحان کے زمانے میں دیکھنے کو ملتی تھی۔کوئی ایک طالب علم حدیث،فقہ یاکسی اور مضمون کی کوئی کتاب بہ آوازِ بلند پڑھتا اور متن کے معنی ومفہوم واضح کرتا جاتا تھا اور بقیہ طلبہ اسے بغور سنتے تھے۔اختلاف یا عدم اتفاق کی صورت میں اس پر سبھی بحث کرنے کے مجاز ہوتے تھے۔

علمی اور لسانی تربیت کی ایک تنومند روایت جامعۃ الفلاح میں عشائیہ(Dinner) سے پہلے کے وقفے تک کی مباحثاتی سرگرمیاں بھی تھیں۔۱۹۸۶ میں جب میں فلاح میں داخل ہوا،تو اس وقت مغرب بعد طلبہ کا غول قافلوں کی شکل میں گزرگاہوں پر چہل قدمی کرتا ہوا ادھر ادھر آتے جاتے نظر آتا تھا۔یہ منظر بڑا دلچسپ ہوا کرتا تھا کہ کسی جماعت کا کوئی ایک طالب علم انگریزی میں بولے جارہا ہے اور بقیہ سبھی طلبہ سنتے اور انکار یا اثبات میں سر کو جنبش دیتے ہیں یاYes اور No کہتے جاتے ہیں۔کوئی دوسرا قافلہ عربی دانوں کا ہے۔عربی زبان میں باتیں ہورہی ہیں اور سامع بڑے انہماک سے ساری باتوں کو بغور سنے جارہا ہے۔بعد میں جب مجھے ان خوش بختوں کی معیت نصیب ہوئی تو پتہ چلا کہ متکلم کوئی سینئر ہے ،جن کی باتیں اپنے ہم جماعت یا برابر کے احباب سے ہوتی ہیں،جونیروں پر ابھی سماعت لازم ہے،تکلم کا مرحلہ آگے آئے گا۔مقام شکر ہے کہ وہ مرحلہ بھی آیا،جب ہم بھی جاں سے گزرنے والوں کی اس مبارک سنت کے وارث بنے اور پھر ہمارے ہی سامنے ہمارے عزیزوں نے اس ثمر آور روایت کا علم اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔یہ وہ ایام تھے جب فلاح کو فکر ونظر کی برتری حاصل تھی۔توقع ہے کہ یہ سنت اب بھی زندہ ہوگی۔ان صحت مند روایات سے وہاں کے فیض یافتگان آج بھی جذباتی لگاؤ رکھتے ہیں۔

اٹھ کر تو آگئے ہیں تری بزم سے مگر
کچھ دل ہی جانتا ہے کہ کس دل سے آئے ہیں

پاکیزہ روایات روح کا درجہ رکھتی ہیں۔روح کمزور ہو تو کئی امراض ایک ساتھ حملہ آور ہوتے ہیں اور متعلقہ نظام میں آپسی کشمکش اور منصب خواہی کا زہر گھول دیتے ہیں۔پھر پے در پے علاقائی عصبیت، مسلکی عناد،گروہ بندی اور نسلی اور علمی تفاخر کو حسب توفیق اپنا کام کرنے کا موقع ہاتھ آجاتا ہے۔فلاح کی دیرینہ معاشرتی اور علمی روایات میں بڑی قوت مدافعت پائی جاتی ہے۔یہ خیر کی علم برادر ہیں۔ان کی بقا فلاح کے نصب العین کو تحفظ فراہم کرنا ہے۔ویسے تو صالح اقدار اور پاک طینت روایات سے ہمارا رشتہ صدیوں پرانا ہے؛ بلکہ ''العلماء ورثة الأنبياء'' کی رو سے ہم باصفا انبیاء کے وارث بھی ہیں پھر اقبالؒ کی طرح پُر امید کیوں نہ رہیں۔ع

پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ

وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہباں

حاجی عبدالرزاق اسماعیل کالسیکرؒ

عبدالبر اثری فلاحی، ناظم اعلیٰ فیروس ایجوکیشنل فاؤنڈیشن، ممبئی،

موبائل:9821906050

عبدالرزاق اسماعیل کالسیکر مرحوم دسور، نزد لانجہ تعلقہ راجہ پور، ضلع رتنا گیری، مہاراشٹر کے رہنے والے تھے۔ آپ کی تاریخ پیدائش ۱۸؍جولائی ۱۹۳۱ء ہے۔ آپ نے ۸۴؍سال عمر پائی۔ ۱۰؍اگست ۲۰۱۵ء بروز پیر اللہ کو پیارے ہوگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

آپ کے گھر والے کوچ کر کے سات راستہ، ممبئی میں آباد ہوگئے تھے اور صابن، صرف وغیرہ کا کاروبار کرتے تھے۔ ابتدائی حالات بہت اچھے نہیں تھے۔ چنانچہ آپ نے دبئی کا رخ کیا۔ وہاں لانڈری کا کاروبار شروع کیا۔ کئی سال محنت ومشقت کرتے رہے لیکن کوئی بڑی کامیابی نہیں ملی۔ چنانچہ وطن واپس لوٹنے کا منصوبہ بنانے لگے۔ لیکن پھر خیال آیا کہ کچھ دوسرا کاروبار کر کے دیکھنا چاہیے۔ چنانچہ سارا اثاثہ جمع کر کے اور کچھ قرض لے کر ۱۹۷۹ء میں پرفیوم کا کاروبار شروع کیا۔ اللہ نے برکت دی اور اتنی برکت دی کہ ۲۰۱۳ء میں فاربس میگزین کے سروے کے مطابق آپ کا شمار دبئی کے ۵۰؍امیر ترین تاجروں میں پینتیسویں نمبر پر ہوا۔ ''الرصاصی پرفیوم'' کے نام سے دنیا بھر میں ۱۱۵؍اسٹور قائم ہیں۔ الجبیل میں بڑا کارخانہ ہے اور تقریباً ۵۰؍سے زائد ملکوں کو سپلائی کیا جاتا ہے۔ اس میں انڈیا، سعودی عرب، لیبیا، زامبیا، افغانستان، یمن وغیرہ بہت سے ممالک شامل ہیں۔

جب آپ نے عطر کا کاروبار شروع کیا تو پہلی ہی ڈیل متحدہ عرب امارات کے شاہی گھرانے سے ہوئی اور تقریباً ۵۰؍ہزار روپے کا عطر فروخت ہوا۔ آپ نے فوراً ہی اللہ کے اس احسان کا شکر اس طرح ادا کیا کہ اس میں سے پانچ ہزار روپے صدقہ کر دیئے۔ اس کے بعد اللہ کا فضل ایسا رہا کہ نہ انہیں پیچھے مڑ کر دیکھنا پڑا اور نہ ہی انہوں نے خلق خدا کی خدمت میں کبھی کوئی کوتاہی کی، فجزاہُ اللہ احسن الجزاء

ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ ''وہ انسان نہیں جو انسان کے کام نہ آئے''، چنانچہ ہمیشہ قوم وملت کے

کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ چند سال قبل جب گجرات میں زلزلہ آیا تو وہاں بلاتفریق مذہب وملت امدادی کاموں میں انہوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور ریکارڈ یہ بتایا ہے کہ رفاہی کاموں میں وہاں تیسرے نمبر پر آپ تھے جنہوں نے تنہا ذاتی حیثیت سے اتنی امداد کی تھی کہ دوسرے ادارے ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔

ملک کے بہت سے اداروں کو مختلف شکلوں میں آپ کی امداد پہنچتی تھی۔ جامعۃ الفلاح بلریا گنج اعظم گڑھ یوپی کی مسجد کی توسیع آپ ہی کی مرہون منت ہے۔ جامعہ عربیہ حسینیہ شری وردھن رائے گڑھ ،مہاراشٹر کی تعمیر وترقی میں بھی آپ کا ہاتھ ہے۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ کی تجدید کاری میں بھی آپ کا بڑا تعاون رہا۔ حتی کہ بعض کتب کی اشاعت کے مکمل اخراجات آپ نے اپنے ذمے لے لیے۔ کریمی لائبریری انجمن اسلام ممبئی کی تجدید کے لئے خطیر رقم دی۔ مولانا سید سلمان حسنی ندوی مدظلہ العالی نے دعاۃ ومبلغین کی تیاری کے لئے لکھنؤ میں سنٹر قائم کیا تو اس کا ایک معتد بہ خرچ آپ ہی فراہم کرتے تھے۔ عصری اداروں کے فارغین اور مدارس کے فارغین کو مختلف جہتوں سے تیار کر کے امت میں قائدانہ و مبلغانہ رول ادا کرنے کے لائق بنانے کے لئے فاران فاؤنڈیشن کے نام سے علی گڑھ میں ایک ادارہ قائم کرایا۔ انجمن اسلام ممبئی کے طلبہ قدیم کوسڈکو پلاٹ خریدنے کے لئے کئی سال قبل تقریباً ۴۰؍لاکھ روپے دیئے تھے بعد میں وہاں پالی ٹیکنک کالج، فارمیسی کالج، اور انجینئر نگ کالج کھولنے کا سوال پیدا ہوا تو اس کے لئے بھی انجمن کو تقریباً ۴۵؍کروڑ روپے فراہم کئے۔ اے ای کالسیکر یونانی طبیہ کالج وہاسپٹل ورسوا ممبئی، اے ای کالسیکر یونانی طبیہ کالج وہاسپٹل جلگاؤں اور اے ای کالسیکر ملٹی اسپشلیٹی ہاسپٹل وکالج ممبرا، تھانہ کلی طور پر آپ کی دین ہے۔ بالخصوص علاقہ کوکن میں پچاسوں اسکول وکالج آپ کے عطیہ سے تیار ہوئے ہیں اور قوم نے احسان شناسی کا ثبوت دیتے ہوئے عموماً ان اسکولوں اور کالجوں کو انہیں کے نام سے موسوم کر دیا ہے۔

آپ نے اپنے کاموں کو منظّم کرنے کے لئے کئی ادارے قائم کئے:

(۱) الحمد ہاسپٹل اینڈ میڈیکل ریسرچ فاؤنڈیشن ممبئی: اس کے آپ خود چیئرمین تھے۔ اس کے تحت مختلف علاقوں (مثلاً مہسلہ، ممبرا وغیرہ) میں ہاسپٹل قائم کئے اور مختلف طرح کی طبی امداد فراہم کیں۔

(۲) اے ای کالسیکر ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ، ممبئی: اس کے تحت ہر سطح کے طلبہ کو ابتدائی واعلیٰ تعلیم کے لئے وظائف فراہم کئے جاتے ہیں۔ امدادی اشیاء مہیا کرائی جاتی ہیں۔ بیواؤں اور یتیموں کو ماہانہ تعاون دیا جاتا ہے اور ضرورت مندوں کی ہر طرح کی ضرورت کی تکمیل کی کوشش کی جاتی ہے۔ خواہ وہ گھر کی تعمیر کا مسئلہ ہو، نوجوانوں کو روزگار فراہم کرنے کا مسئلہ ہو۔ وغیرہ وغیرہ

(۳) فیروس ایجوکیشنل فاؤنڈیشن، ممبئی: اس کی آپ مستقل سرپرستی فرمارہے تھے۔ یہ ادارہ علاقہ کوکن و گوا کے اسکولوں اور کالجوں میں دینی تعلیمی اسکیم چلاتا ہے ۔ یہ ایک منفرد تجربہ ہے جسے مختلف اکابرین اور دانشوروں نے سراہا ہے۔ ۲۰۰۰ء میں اس کی شروعات کی گئی تھی اور اس وقت الحمدللہ ۸۷؍ ہائی اسکول و کالجز اس اسکیم سے استفادہ کررہے ہیں۔ اس کے تحت اردو وانگریزی میں دینیات کا نصاب تیار کیا گیا، ہر اسکول کو معلمین دینیات فراہم کئے گئے، ہر اسکول کی لائبریری میں دینی کتب مہیا کرائی گئیں۔ مختلف طرح کے ثقافتی مقابلوں کا انعقاد کیا گیا، اردو زبان میں کمزور طلبہ کے معیار کو درست کرنے کے لئے اردو کی اضافی تدریس کی اسکیم چلائی گئی، S.S.C کے طلبہ کا رزلٹ بہتر بنانے کے لئے نمونہ کے مشقی پیپرس فراہم کئے گئے۔ وغیرہ وغیرہ

ان کے علاوہ بھی کتنے اداروں کی آپ سرپرستی فرمارہے تھے وہ صرف آپ اور آپ کا خدا جانتا ہے۔ آپ کے بڑے بیٹے جناب محمد سلیم کالسیکر صاحب ایک ملاقات میں فرمانے لگے کہ ''والدمحترم کی علالت سے پہلے ہم لوگوں کو کچھ بھی معلوم نہیں تھا کہ آپ کہاں کہاں اور کیا کیا کام کررہے ہیں، اب جب مختلف ذرائع سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی والدمحترم کررہے تھے اور وہ بھی والدمحترم کررہے تھے تو خود ہمیں تعجب ہوتا ہے کہ وہ اس قدر کام کیسے کررہے تھے؟'' آپ کے دیرینہ رفیق مکرمی جناب عبدالغنی اطلس والا صاحب کا بیان ہے کہ ''انہوں نے اور حاجی صاحب نے ملک کے نمایاں اور نمائندہ اداروں (دارالعلوم دیوبند، ندوۃ العلماء لکھنؤ، جامعۃ الفلاح بلریا گنج، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، ہردوئی اور باندہ وغیرہ) کا دورہ کیا تھا، وہاں کے اکابرین اور ذمہ داران سے ملاقاتیں کی تھیں۔ دورانِ سفر وہاں کی صورت حال کو سمجھنے کے لیے مختلف طرح کی معلومات براہِ راست حاصل کی تھیں۔ ان اداروں کی ہمہ جہت ترقی کے لئے مختلف زاویوں سے سوچتے رہتے تھے اور جب جیسی ضرورت ہوتی ہر ایک کا بھرپور تعاون بھی کرتے رہتے تھے۔ ان اداروں کو مؤثر اور فعال بنانے کے لئے ہمیشہ کوشاں رہے۔ کارِ خیر کو چھپانا افضل اس لئے آپ برابر اس کا التزام کرتے کہ کسی کو اس کی خبر نہ ہو'۔

آپ صوم وصلوٰۃ اور اسلامی احکامات کے انتہائی پابند تھے۔ کوئی کام اس میں آڑے نہیں آتا تھا۔ خواہ شادی ہو، میٹنگ ہو، پروگرام ہو، اذان سنتے ہی آپ کام بند کردیتے اور سیدھے مسجد کا رخ کرتے تھے۔ باجماعت نماز کی ادائیگی کے بعد ہی دوبارہ کاموں کو ہاتھ لگاتے تھے۔

آپ کے زیر صدارت المالطیفی ہال، صابوصدیق پالی ٹیکنک کالج بائیکلہ ممبئی میں پروگرام چل رہا تھا۔ اذان ہوتے ہی آپ نے بند کرادیا۔ بقیہ پروگرام نماز کے بعد مکمل کئے گئے۔ آپ کے بیٹے کی شادی تھی۔ اسلام جمخانہ گراؤنڈ پر استقبالیہ کا انتظام تھا۔ وہاں سے مسجد کچھ فاصلے پر ہے۔ مغرب کا وقت ہوتے ہی سب کچھ چھوڑ کر آپ سیدھے مسجد پہنچے اور تکبیر اولیٰ کے ساتھ نماز ادا کی پھر انتظامات کی طرف

توجہ فرمائی ۔آپ کا معمول تھا کہ ادھر چند سالوں سے ہر سال رمضان کا پورا مہینہ یکسو ہوکر حرم میں گزارتے تھے۔ایک سال تو گر گئے، کمر میں شدید چوٹ آئی ۔ڈاکٹر نے مشورہ دیا کہ آرام کریں لیکن پھر بھی مہینہ مکمل کئے بغیر آپ نہیں لوٹے، تہجد کا بھی اہتمام کرتے تھے۔ایک موقع سے فرمانے لگے کہ ''انجمن اسلام ممبئی سے مجھے اتنی محبت ہے کہ میں تہجد میں اس کا نام لے کر اس کی بقاوتحفظ اورترقی وتوسیع کے لیے دعا کرتا ہوں''اس سے آپ کی فکرمندی اورقوم وملت کے تئیں آپ کی دردمندی کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

خدا ترسی اور خوف خدا آپ کے اندر کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔الحمد ہاسپٹل اینڈ میڈیکل ریسرچ فاؤنڈیشن ممبئی کے تحت ایک ہاسپٹل مہسلہ، شری وردھن رائے گڑھ میں جاری ہے۔وہاں کسی کام سے ممبئی آفس سے ایک فرد کو بھیجا گیا جو دور سے آپ کے رشتے دار بھی ہوتے ہیں۔انہوں نے وہاں پہنچ کر وہاں کی صورت حال دیکھی تو انہیں تکلیف ہوئی ۔بعض مہنگی مشینیں بغیر استعمال یوں ہی پڑی تھیں۔اس پرانہوں نے وہاں کے ذمہ داران سے کچھ سخت لہجہ میں گفتگو کی ۔ذمہ داران نے کہا تمہیں اس سے کیا مطلب؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ میرے بھائی کا سرمایہ ہے یوں ہی برباد ہوا اچھا نہیں ہے۔اس پر مجھے تکلیف ہے اس لئے میں پوچھ رہا ہوں ۔ بہرحال ذمہ داران نے پھر حاجی صاحب سے ان کی شکایت درج کرائی کہ یہ غیر متعلق افراد اس طرح مداخلت کیوں کرتے ہیں؟ یہ باور کرایا کہ محض رشتہ داری کی آڑ لے کر ذمہ داران کو پریشان اور بے عزت کرتے ہیں، للٰہذا حاجی صاحب نے ان سے سخت باز پرس کی، چنانچہ خیر خواہانہ جذبہ کے باوجود سخت باز پرس پر وہ رو پڑے اور چپ چاپ رخصت ہوگئے، چند ہی لمحوں بعد حاجی صاحب پر ایسا خوف خدا طاری ہوا کہ وہ پریشان ہوگئے اور خود رونے لگے پھر اس آدمی کو بلایا اور معافی طلب کی، نیز دیر تک روتے رہے حالانکہ وہ آدمی ادارے میں ملازم تھا۔یہ تھا آپ کا خوف خدا اور یہ تھا آپ کا سلوک اپنے ماتحتوں کے ساتھ کہ ذرا اس کو تکلیف پہنچی تو آپ پریشان ہوجاتے اور اس سے معافی تک طلب کرتے۔

آپ اخلاق کریمانہ کے پیکر تھے۔ ہر ایک سے بڑی اپنائیت اور خاکساری کے ساتھ ملتے۔ ایسا لگتا کہ بہت پرانی شناسائی ہے۔کیا چھوٹے کیا بڑے، ہر ایک سے یکساں سلوک رہتا۔ بلا تکلف ہر ایک اپنا مدعا بیان کرتا۔ باتیں بڑے غور سے سنتے اور ہر ایک کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتے۔آپ کے ساتھ کئی مرتبہ مختلف ایشوز پر گفتگو کا موقع ملا۔ ہر موقع پر میں نے محسوس کیا کہ آپ معقول بات بلا جھجک بہت جلد قبول کر لیتے۔آپ کے اندر وسعت قلبی اور وسعت نظری پائی جاتی تھی۔

لوگ مختلف تنگنائیوں میں گھیرنا چاہتے لیکن آپ نے اپنا ذہن ہمیشہ کھلا رکھا۔آپ کے رویے اور برتاؤ ہر چیز سے یہ جھلکتا تھا۔چنانچہ دیارِ غیر (دبئی) میں جا بسنے کے باوجود عرب امراء وعلماء کا جو اعتماد

آپ کو حاصل تھا اس کی بنیادی وجہ دراصل یہی تھی۔اسی طرح ملک کے ہر طبقہ کے علماء وقائدین آپ کے رابطے میں تھے تو اس میں بھی دراصل اسی خوبی کو دخل تھا۔ایک مرتبہ تو آپ نے ہدایت فرمائی کہ ہر طبقہ کے علماء کو اپنے پروگراموں میں دعوت دو اور کچھ ناموں کی نشاندہی بھی فرمائی کہ اِن کو اِن کو دعوت دو۔ آپ سے جس کی ایک بار ملاقات ہو جاتی وہ آپ کا اسیر ہوئے بغیر نہ رہتا اور یادوں کے بہت سے نقوش اپنے ساتھ لے جاتا۔

آپ کی سب سے بڑی خوبی آپ کا دردمند دل تھا۔زمینی سطح سے ثریا تک پہنچنے میں آپ نے گردشِ زمانہ کے جتنے تھپیڑے جھیلے تھے اس نے آپ کو بہت حساس، غمخوار اور حقیقت پسند بنا دیا تھا۔ چنانچہ آپ نے خدمت خلق کو اپنا مشن بنالیا تھا۔آپ کا کوئی عمل اس سے خالی نظر نہیں آتا۔بسا اوقات تو ایسا محسوس ہوتا کہ تکلیف سہنے والے سے زیادہ آپ تکلیف محسوس کر رہے ہیں۔عید کی خوشیوں میں برابر کا شریک بنانے کے لئے بلا مطالبہ ازخود آپ نے معلمین دینیات کے لئے عیدالاؤنس کا سلسلہ شروع کیا۔ جو آج تک قائم ہے۔میرے علم میں نہیں کہ کسی کی واقعی ضرورت ان کے سامنے پیش کی گئی ہو اور اس کی انہوں نے تکمیل نہ فرمائی ہو۔ بلکہ بسا اوقات تو بعض معاملات میں یہ گمان گزرتا کہ غیر مستحق نے جھانسہ دے دیا ہے۔ایک دو مرتبہ توجہ دلائی گئی تو فرمانے لگے ''میرا کام تو اللہ کی امانت پہنچانا ہے بقیہ حساب و کتاب اللہ کے ذمہ ہے'' بہر حال یہ ایسا پہلو ہے کہ اصل حقیقت قیامت کے دن ہی اجاگر ہوگی۔مختصر یہ کہ آج ملت ایسے محسن سے محروم ہوگئی جس کا ثانی بظاہر نظر نہیں آرہا ہے۔الّا یہ کہ اللہ ملت پر کرم فرمائے۔ اور کوئی ان کا نعم البدل پیدا فرمادے۔

پس ماندگان میں بیوہ، چھ بیٹے (انیس، امتیاز، جمیل، ریاض، سلیم، سراج) اور تین بیٹیاں ہیں۔ اللہ ان سب کو صبر جمیل کی توفیق عنایت فرمائے۔۱۰ر دسمبر ۲۰۱۲ء سے حاجی صاحب صاحب فراش تھے۔ لیکن یہ اللہ کا فضل اور اولاد کی سعادت ہی ہے کہ انہوں نے نہ آپ کے علاج و معالجہ میں کسی طرح کی کوئی کمی ہونے دی، بلکہ گھر ہی ہاسپٹل بنوا ڈالا اور نہ ہی آپ کے جاری کردہ کاموں ہی میں کسی طرح کا کوئی رخنہ پڑنے دیا۔وہ سب یک زبان ہیں کہ ''بابا کا جو کام ہے انہیں ہم جاری رکھیں گے'' اللہ بیش از بیش توفیق عنایت فرمائے۔آمین ثم آمین

غزل

یہ وہم ہے میرا کہ حقیقت میں ملا ہے
خورشید مجھے وادیٔ ظلمت میں ملا ہے

شامل مری تہذیب میں ہے حق کی حمایت
انداز بغاوت کا وراثت میں ملا ہے

تاعمر رفاقت کی قسم کھائی تھی جس نے
بچھڑا ہے تو پھر مجھ کو قیامت میں ملا ہے

رکتے ہی قدم پاؤں پکڑ لیں نہ مسائل
ہر شخص اسی خوف سے عجلت میں ملا ہے

کچھ اور ٹھہر جاؤ سر کوئے تمنا
یہ حکم مجھے لمحۂ ہجرت میں ملا ہے

آداب کیا جائے کسے کتنے ادب سے
یہ فن مجھے برسوں کی ریاضت میں ملا ہے

صیاد نے لگتا ہے کہ فطرت ہی بدل دی
ہر پھول مجھے خار کی صورت میں ملا ہے

سید راشد حامدی فلاحی،
شاہین باغ۔نئی دہلی،
موبائیل نمبر:9811126467

دماغ

شکر ہے اللہ کا جس نے ہمیں بخشا دماغ
حق رسا وحق پذیر وحق نما اعلیٰ دماغ
یہ دکھائے راستے خیر وسعادت کے ہمیں
بے بہا و بے بدل قدرت کا ہے تحفہ دماغ
کارگر ہوتی ہے پند وموعظمت اس کے لیے
صاف ستھرا کبر سے رکھتا ہے جو اپنا دماغ
جو غرور علم وجاہ ومال میں ہے مبتلا
دور رہتا ہے ہمیشہ خیر سے اس کا دماغ
رہتے ہیں وہ لوگ تیرہ بختیوں ہی میں سدا
موڑ کر منھ جو حقائق سے رکھیں اونچا دماغ
کہتا ہے ان کو اولو الالباب قرآن عزیز
جو کھلا رکھتے ہیں عبرت کے لیے اپنا دماغ
کتنی قوموں کا مقدر فتح ونصرت ہوگئی
واسطے حق کے انہوں نے جب کھلا رکھا دماغ
کتنی قومیں ہوگئیں نذر اجل تاریخ میں
آسماں پر جب ہوا ان بدنصیبوں کا دماغ
حد سے آگے بڑھ گئی جب سرکشی نمرود کی
آکے اس کا مچھروں نے کر دیا ٹھنڈا دماغ
زندگی کی مشکلیں عارف نہ چھوڑیں گی تجھے
کام میں جب تک نہیں لائے گا تو اپنا دماغ

عارف آئمی، استاذ جامعۃ الفلاح

غزل

معجزے کا در کھلا اور اک عصا روشن ہوا
دور گہرے پانیوں میں راستہ روشن ہوا

جانے کتنے سورجوں کا فیض حاصل ہے اُسے
اُس مکمّل روشنی سے جو ملا روشن ہوا

آنکھ والوں نے چرالی روشنی ساری تو پھر
ایک اندھے کی ہتھیلی پر دیا روشن ہوا

ایک وحشت دائرہ در دائرہ پھرتی رہی
ایک صحرا سلسلہ در سلسلہ روشن ہوا

مستقل اک بے یقینی، اک مسلسل انتظار
پھر اچانک ایک چہرہ جابجا روشن ہوا

آج پھر جلنے لگے بیتے ہوئے کچھ خاص پل
آج پھر اک یاد کا آتش کدہ روشن ہوا

جانے کس عالم میں لکھی یہ غزل تم نے نبیلؔ
خامشی بجھنے لگی، شہرِ صدا روشن ہوا

عزیز نبیل، قطر

غزل

ممکن نہیں کہ تیری دعامیں اثر ملے
جب تک نہ دل میں سوز ہواور چشم تر ملے

سانسوں کا زیروبم ہے دلیل فنائیت
ہر ایک کو بھلا کہاں عمر خضر ملے

نرگس کی اشک شوئی نہ ہوجائے رائیگاں
یارب چمن کو اب تو کوئی دیدہ ور ملے

ابر خلوص بن کے برستا ہے دم بہ دم
''رستے میں خواہ دوست کہ دشمن کا گھر ملے''

ڈھل جائیں گی یقین ہے گنہ کی سیاہیاں
توبہ کے جام کا کوئی قطرہ اگر ملے

صورت گری خیال کی دشوار ہے بہت
عطیہ ہے رب کا جس کو یہ اختر ہنر ملے

سعید اختر اعظمی،
سعودی عرب

غزل

کہیں بھی وسعت افلاک میں نہیں ملتا
خدا اگر دلِ صد چاک میں نہیں ملتا

گمانِ سبز ہے جس دم سے موجزن مجھ میں
میں اپنے حیطۂ ادراک میں نہیں ملتا

یہ دل پرندہ تبھی تک ہے شاخ پر محفوظ
کہ جب تلک تیرے فتراک سے نہیں ملتا

گلاب صورتیں اگتی نہیں زمینوں سے
ہمارا خون بھی اب خاک میں نہیں ملتا

برہنگی ہے مسلط یوں اپنے ذہنوں پر
خیال کوئی بھی پوشاک میں نہیں ملتا

سوال کیسے بھی ہوں ''کن فکاں'' سے وابستہ
جواب کیا ہے جو ''لولاک'' میں نہیں ملتا

امیدیں ایسی بجھی ہیں کہ اب خوشی کا اثر
کسی بھی جشن طربناک میں نہیں ملتا

ارشد جمال صارمؔ،
منصورہ طبیہ کالج، مالیگاؤں، مہاراشٹر

نذرِ منشی محمد انور صاحب حفظہ اللہ ورعاہ

میرے غریب خانے کے مہماں تمہیں تو ہو
در عدن بھی، لعل بدخشاں تمہیں تو ہو

تیرے قدم پڑے کہ ضیاء پاشیوں کا دور
پھولوں کی صورتوں میں وہ خنداں تمہیں تو ہو

کاٹی ہے جس کی چاہ میں یہ زندگی کی قید
اس صبر اس سکون کا ساماں تمہیں تو ہو

جس سے جہان معنی میں ہلچل ہو بار بار
وہ سر فروش قائد رنداں تمہیں تو ہو

دیکھا تمہیں تو روح کو تسکین ہو گئی
بیماریٔ حیات کا درماں تمہیں تو ہو

ظلمت کی شاہ زادی چرانے لگی ہے آنکھ
لرزاں ہے جس سے وادیٔ زنداں تمہیں تو ہو

آمد پہ جس کی آج یہ ساگر کی بے بسی
وہ موج تندو تیز وہ طوفاں تمہیں تو ہو

آنکھوں کی روشنی ہو دلوں کا سرور ہو
وہ جاں نواز ساکن مژگاں تمہیں تو ہو

اپنے نصیب جاگے کہ تجھ سا کوئی ملا
ظلم وستم کے دور میں رقصاں تمہیں تو ہو

تیری مشقتوں کا ارے ذکر کیا کروں
میدان کارزار میں مرداں تمہیں تو ہو

تڑپے ہے جس کی چاہ میں خانہ خراب دل
ناز کبار، نازش طفلاں تمہیں تو ہو

جب جب مصیبتوں نے کچلنے کی ٹھان لی
ایسے میں سجدہ ریز و گریاں تمہیں تو ہو

تاریکیوں کی چھاؤں میں جب سو رہا تھا گھر
وجہ وروِ دانش وعرفاں تمہیں تو ہو

صحراء نوردی، کوہ کنی، جادۂ خطر
ہر ساز زندگی پہ غزل خواں تمہیں تو ہو

کیسے کہوں کہ تجھ سا کوئی دوسرا نہیں
شمع حیات گلشن ارماں تمہیں تو ہو

میرا وجود جس سے بھی کرتا ہے کسب فیض
وہ پیر وہ فقیر، وہ انساں تمہیں تو ہو

محمد امین احسن، بلریا گنج۔اعظم گڑھ، موبائل نمبر:9935015512

تعارف وتبصرہ

نام کتاب: Empowerment of women under the prophet of Islam (مقالات سمینار)

مرتبین : پروفیسر عبیداللہ فہد فلاحی، پروفیسر محمد صلاح الدین عمری

قیمت: درج نہیں ہے۔ **صفحات**:۸۰۰/

ناشر: سیرت کمیٹی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

مبصر: ضمیر الحسن خان فلاحی، علی گڑھ

اسلام ایک کامل اور عملی الٰہی شریعت ہے جو حیات انسانی کے جملہ امور سے بحث کرتی ہے، اور ہر شعبہ زندگی کے لئے ہدایت فراہم کرتی ہے۔عصر جدید میں جبکہ اسلام چکی کے دو پٹوں کے درمیان پس رہا ہے وقت کا اہم تقاضا ہے کہ اسوہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو راہ عمل اور ذریعہ نجات بنایا جائے جیسا کہ پروفیسر عبیداللہ فہد نے اپنے مقدمہ میں وومین امپاورمنٹ کو عصر حاضر کا سلگتا ہوا موضوع قرار دیا ہے۔

یوں تو ربیع الاول کا مہینہ عالم اسلام میں جلسہ ہائے سیرت کے لئے معروف ہے، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں باقاعدہ سیرت کمیٹی کے نام سے ایک ادارہ موجود ہے جو ہر سال مختلف ومتنوع پروگرام منعقد کرتا ہے، لیکن ان جلسوں میں اس امر پر توجہ کم ہی ہو پاتی ہے کہ سیرت طیبہ کو ابدی اسوہ کی حیثیت سے پیش کیا جائے۔ میرے علم کی حد تک علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی تاریخ میں پہلی بار ایسا ہوا کہ اس پہلو پر خاطر خواہ توجہ دی گئی اور ایسے پروگرام ترتیب دیئے گئے جو اپنی نوعیت اور ماہیت ہر دو اعتبار سے دوررس اثرات رکھتے تھے۔ زیر تبصرہ کتاب ’’Empowerment of women under the prophet of Islam‘‘ اسی توجہ کا عملی مظہر ہے۔ یہ دراصل ان مقالات کا مجموعہ ہے جو سیرت تقریبات کے تحت اے، ایم، یو، کے مختلف شعبہ جات کے ریسرچ اسکالرس نے مورخہ ۲۰/جنوری ۲۰۱۵ء کو منعقد ہونے والے سمینار میں پیش کئے۔

مقالہ نگاران نے مرکزی موضوع کے تحت وقت کے اہم اور زیر بحث موضوعات کا احاطہ کیا، اور ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ قرآن ہی وہ واحد کتاب ہے جس نے عورت کی توقیر کی ہے اور اسے مساوی حقوق عطا کئے ہیں۔ انسانی معاشرہ میں عورت کی حیثیت ماں، بہن، بیوی اور بیٹی کی حیثیت سے

مسلم ہے۔ مرد کو جوہر قابل بنانے میں عورت کا جو کردار ہے، وہ محتاج بیان نہیں ہے لہٰذا سماج کی اس اہم اکائی کو ان کے حقوق سے محروم رکھنا یا انہیں بازار کی زینت بنا دینا دونوں ہی رویے ان کے ساتھ کھلی ناانصافی اور ان کی عزت و ناموس کے ساتھ کھلواڑ ہیں۔ پاکیزہ، پرامن اور پرسکون زندگی گزارنا ہر فرد بشر کا بنیادی حق ہے، خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔

یہ مجموعہ اردو، عربی اور انگریزی تینوں زبانوں پر مشتمل ہے۔ جن میں ۲۰ / اردو، ۹ / عربی اور ۴۲ / انگریزی کے مقالات شامل ہیں۔ اردو میں جن موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے ان میں سے کچھ یہ ہیں:

اسلام میں تعلیم نسواں

خواتین کے اقتصادی حقوق

عورت سامان تجارت - اسلام اور مغربی نقطہ نظر

اسلام ہی عورت کا نجات دہندہ

حجاب اور مغرب

اسلام میں عورت کی ہمہ جہت ترقی

اسلام اور آزادی نسواں

علم حدیث میں عورت کی خدمات۔

عربی کے چند قابل ذکر مقالات:

تمکین المرأ ۃ فی عهد النبیؐ

العد االة الاسلامیه فی قضیة المرأ ة

اور تکریم المرأ ۃ فی الاسلام

انگریزی کے بعض اہم مقالات یہ ہیں:

Rethinking Islamic feminist Hermeneutics.

Hijab and West: challenges and opportunities.

Towards Empowering the women .

Modern challenges to the women empowerment.

ان متنوع موضوعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ مذکورہ سمینار نے وقت کی ایک اہم ضرورت کی تکمیل کی ہے۔ مقالات زبان و بیان اور مواد و استدلال ہر اعتبار سے لائق تحسین اور قابل مطالعہ ہیں۔ امید ہے کہ یہ مجموعہ مسلم و غیر مسلم سماج کے لئے ایک وقیع تحفہ ثابت ہوگا۔

قابل صد مبارکباد ہیں سیرت کمیٹی کے کنویز پروفیسر عبید اللہ فہد اور سمینار کے کنویز پروفیسر محمد صلاح الدین عمری کہ انہوں نے اس اہم ترین موضوع پر سمینار کا انعقاد کر کے طالبان فکر و تحقیق کے لئے میدان

فراہم کیا اور سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے انہیں روحانی غذا حاصل کرنے کا حسین موقع دیا۔

مجموعہ مقالات کے سلسلہ میں ایک چیز جسے ملحوظ رکھنا چاہئے تھا وہ یہ کہ اردو مضامین کی ترتیب میں اردو زبان کا خیال رکھا جاتا، ان کی ترتیب بھی انگریزی طرز پر ہوگئی ہے۔اسی طرح فرنٹ ٹائٹل کور کی طرح بیک ٹائٹل کور بھی اردو میں ہوتا تو شاید اور اچھا لگتا۔

بعض مقامات پر پروف/ املا کی غلطیاں بھی رہ گئی ہیں، مثلاً: صفحہ ۲۹ ۷/ پر ابن حجر اسقلانی الف سے لکھا ہے جبکہ ''ع'' سے ہونا چاہئے ،صفحہ ۱۲ ۷/ پر دوزخ ''(ذ) سے لکھا گیا ہے حالانکہ صحیح تلفظ دوزخ ہے، ص ۶۹۷/ کی آخری سطر میں ترمزی ''ز'' سے لکھا گیا ہے جبکہ صحیح ''ترمذی'' ہے۔ص ۶۸۰/ پر ایک حدیث کا ذکر ہے ''تزوجواالودودالمولود' اس کے نقل کرنے میں دو غلطیاں سرزد ہوئی ہیں، ایک تو تزوجوا 'ذ' سے لکھا ہے جبکہ 'ز' سے ہونا چاہئے ، دوسرے حدیث میں المولود نہیں بلکہ 'الولود' کا لفظ آیا ہے، ص ۴۳۶/ کے ایک حوالہ میں لکھا ہے ''طبع یازدھم'' جبکہ مضمون عربی زبان میں ہے، اسی طرح ص ۵۵۷/ کے پورے مضمون کے حوالے الٹے درج ہوگئے ہیں مثلاً: ۱۴/ کی جگہ ۴۱/، ۱۵/ کی بجائے ۵۱/ وغیرہ۔امید کہ آئندہ ایڈیشن مزید اہتمام کے ساتھ شائع کیا جائے گا، بہر حال بحیثیت مجموعی یہ قابل مطالعہ اور مفید پیشکش ہے، توقع ہے اس سے کما حقہ فائدہ اٹھایا جائے گا۔

نام کتاب: جدیدیت کا مغنی۔اسعد بدایونی

مصنف و ناشر: محمد رضوان خان

سن اشاعت: فروری ۲۰۱۵ء، **قیمت:** ۱۱۲/ روپے، **ضخامت:** ۲۰۸/ صفحات

پته: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، دہلی۔۱۱۰۰۰۶

مبصر: عشرت مجیب

زیر تبصرہ کتاب 'جدیدیت کا مغنی۔اسعد بدایونی' کے مصنف جناب محمد رضوان خان شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی سے پی۔ایچ۔ڈی کر رہے ہیں۔رضوان خان کی اس سے قبل ایک اور کتاب بہ عنوان 'اسعد بدایونی بحیثیت شاعر' مارچ ۲۰۱۳ء میں منظر عام پر آئی تھی جو کافی مقبول ہوئی تھی۔متذکرہ کتاب میں فاضل مصنف نے اسعد بدایونی کو بحیثیت شاعر کے ادبی دنیا میں متعارف کرایا تھا۔اسی سلسلے کی کڑی یہ دوسری کتاب ہے جس میں مصنف نے اسعد بدایونی کو جدیدیت کا مغنی گردانا ہے۔

اس کتاب کو مصنف نے پروفیسر ابوالکلام قاسمی اور پروفیسر طارق چھتاری کے نام منسوب کیا ہے۔ کتاب کے دائیں فلیپ پر جناب ظفر اقبال (لاہور) اور بائیں فلیپ پر عرفان صدیقی (لکھنؤ) کے تأثرات کو جگہ دی گئی ہے۔اس کتاب میں کل ۱۰/ مضامین ہیں، جس میں ایک مضمون اسعد بدایونی کا اپنا تحریر کردہ ہے۔

’حرفِ چند‘ کے عنوان سے مصنف نے اپنے مقدمے میں اسعد بدایونی اور جدیدیت سے ان کے گہرے روابط پر کھل کر بحث کی ہے۔شاید یہی وجہ ہے کہ کتاب کا عنوان بھی ’جدیدیت کا مغنی۔اسعد بدایونی‘ رکھا ہے۔اس کتاب میں مصنف نے اسعد بدایونی کو جدید شاعری کے حوالے سے متعارف کرایا ہے۔

کتاب کے پہلے مضمون بعنوان ’اسعد بدایونی۔شخص اور شاعر‘ میں مصنف نے اسعد بدایونی کی شخصیت اور شاعری پر جو تفصیلی بحث کی ہے اس سے اسعد بدایونی کا جدیدیت سے رشتہ اور ساتھ ہی ساتھ ہم عصروں میں ان کے مقام کا تعین ہو جاتا ہے۔اسی طرح اگلا مضمون ’جدید اردو غزل اور اس کی روایت‘ ہے جو دراصل مرحوم اسعد بدایونی کا تحریر کردہ ہے۔اس مضمون میں اسعد بدایونی نے کئی ایک شعراء کے اشعار کو بطورِ مثال پیش کر کے جدید شاعری سے بحث کی ہے۔اور بتایا ہے کہ کس طرح ’نئی نسل روایت سے وابستہ بھی ہے اور روایت سے پابستہ بھی نہیں۔‘ایک اور مضمون ’اسعد بدایونی۔ایک بے مثال انسان‘ میں مصنف نے مرحوم اسعد بدایونی سے اپنے گہرے مراسم اور چند نجی واقعات کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ایک مضمون ’اسعد بدایونی اور جدید تر غزل۔ہم عصر شعراء کے حوالے سے‘ ہے۔اس میں اسعد بدایونی اور جدیدیت سے ان کے رشتہ پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔اسعد بدایونی کے ہم عصر شعراء اور ان کے اشعار کا حوالہ دیتے ہوئے مصنف دعویٰ کرتے ہیں کہ اسعد بدایونی کی شاعری جدیدیت پر مبنی تھی۔وہ اپنے ہم عصر شعراء میں منفرد مقام رکھتے ہیں۔ان کا اندازِ بیان، پر شکوہ الفاظ کا استعمال، بات کا لہجہ یہ سب کچھ ہم عصروں سے جدا اور الگ ہے۔’اسعد بدایونی اور تصورِ اَنا‘ میں مصنف نے اسعد بدایونی کے اشعار کے حوالے سے ان کی شاعری میں اَنا کے ظہور پر اپنے تأثرات قلم بند کئے ہیں۔بعض کئی حوالے دے کر لکھتے ہیں کہ اسعد بدایونی کے یہاں پائے جانے والے الفاظ جس کا انعکاس ’اَنا‘ سے ظاہر ہوتا ہے، اسے اس طرح سمجھنا چاہئے کہ اَنا خود پسندی نہیں، بلکہ یہ ضمیر کی آواز ہے۔’اسعد بدایونی اور تصورِ عشق‘ میں مصنف نے اسعد بدایونی کے اشعار میں عشق کے تصور کا جائزہ لیا ہے۔’اسعد بدایونی کی غزلوں میں شعری صنعت کا التزام‘ میں شاعر کے اشعار میں شعری صنائع کے التزام پر گفتگو ہے۔اسعد بدایونی نے اپنی غزلوں میں صنائع کا التزام جس خوبی سے کیا ہے عقل دنگ رہ جاتی ہے۔’اسعد بدایونی کی شاعری میں عصری معنویت کی تلاش‘ میں ان کی شاعری میں عصری آگہی اور جدید تر لب و لہجہ کے امتزاج پر گفتگو ہے۔اگلے باب ’منظوم خراجِ عقیدت‘ کے تحت مصنف نے متعدد شعراء کے کلام کو پیش کیا ہے۔کتاب کے آخر میں اسعد بدایونی کی ۴۲ منتخب غزلوں کو جگہ دی گئی ہے۔

سرورق خوبصورت اور دیدہ زیب ہے۔بیک گراونڈ میں اسعد بدایونی کی تصویر بھی خوب ہے۔پروفیسر شہپر رسول (شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ) نے اس کتاب کے بارے میں اپنے تأثرات کا اظہار کرتے ہوئے نئی غزل کی تنقید کو مصنف کا خاص میدان قرار دیا ہے اور مبارک باد بھی پیش کی ہے۔ امید ہے اسعد شناسی کے سلسلے میں یہ کتاب مفید ثابت ہوگی۔

آپ کے خطوط

الحمدللہ گزشتہ شمارے سے متعلق قارئین کے تأثرات کافی بڑی تعداد میں موصول ہوئے، البتہ صفحات کی قلت کے سبب جملہ تأثرات کوشامل اشاعت کرنا ممکن نہ تھا، چنانچہ یہاں معذرت کے ساتھ محض چند خطوط کی اشاعت پر اکتفا کیا جارہا ہے۔ **مدیر)**

عبدالحق فلاحی، ابوالفضل انکلیو، اوکھلا۔نئی دہلی

برادرعزیز ومکرم جناب ابوالاعلیٰ سید سبحانی صاحب سلام ورحمت

''ہمارے زمانے کا جامعہ'' کے زیرعنوان اپنے تأثرات قلم بند کرنے کے لیے آپ کا خط ملا۔شکریہ میرے لیے یہ بڑی خوش نصیبی کی بات ہے کہ انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کے ترجمان حیات نو کے پلیٹ فارم سے اپنے ہم چشموں، خوردوں اور بزرگوں، اورالسابقون الاولون والآخرون سے ہم کلام ہونے کا موقع مل رہا ہے۔اس تمام ترجستجو اور جدو جہد اورصبر واستقامت کے لیے آپ یقیناً مبارک باد کے مستحق ہیں اور ہم سب کے شکریہ کے بھی کہ ایک ایک فرد سے رابطہ قائم کرنے، یاددہانی کراتے رہنے اور جواب حاصل کرنے میں آپ نے ایک جاں گسل مرحلہ طے کیا، حالانکہ لوگ مرحلہ شوق طے نہ ہونے کی دعا دیتے ہیں۔ بہرکیف آپ ہم سب کے شکریہ وسپاس کے مستحق ہیں کہ حیات نو کا قلم دان سنبھالنے کے بعد اسے صوری ومعنوی اور ظاہری وباطنی ہر اعتبار سے، خوب سے خوب تر بنانے اوراس میں جان ڈالنے کی آپ نے بھرپور جدو جہد کی جس کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔اللہ آپ کی کوششوں میں برکت دے۔

عبالبر اثری فلاحی، ناظم اعلی فیروس ایجوکیشنل فاؤنڈیشن

مکرمی ایڈیٹر صاحب، حیات نو، جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڑھ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

حاجی عبدالرزاق کالسیکر کا جامعۃ الفلاح سے خاص لگاؤ تھا، آپ جامعہ تشریف لا چکے ہیں۔ جامعہ کی مسجد کی توسیع آپ ہی کی مرہون منت ہے۔کلیۃ البنات میں کلاس روم فرنیچر کی فراہمی میں بھی آپ کا رول ہے۔اس کے علاوہ بھی مختلف انداز سے آپ جامعہ کا تعاون کرتے رہتے تھے۔ان کی

حیات وخدمات پر ایک مضمون برائے اشاعت ارسال ہے۔ امید کہ قریبی شمارے میں شامل فرما کر ممنون کریں گے۔

امتیاز وحید، نئی دہلی

عزیز گرامی!

آپ کی ادارت میں حیاتِ نو نے جس طرح زندگی کا ثبوت فراہم کرنا شروع کیا ہے اور اپنے بیشتر مشمولات میں فلاحیوں کی شرکت کو یقینی بنایا ہے وہ یقیناً حوصلہ افزا ہے؛ آپ کی اس کدو کاوش کا حاصل تو یہ ہے کہ اسے زیادہ سے زیادہ لوگوں کے ہاتھوں تک پہنچایا جاتا لیکن یہ لکھتے ہوئے اچھا محسوس نہیں ہوتا کہ نظم ونسق کے تعلق سے حیاتِ نو کی موجودہ صورت حال سے ہمارے اکثر رفقا بے اطمینانی کا اظہار کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ علی گڑھ یونٹ کی مستقل یہ شکایت ہے کہ حیاتِ نو وقت پر نہیں ملتا۔ حالیہ شمارہ ابھی تک علی گڑھ میں دستیاب نہیں۔ ممکن ہے یہی صورت حال دوسری جگہوں کی بھی ہو۔ توقع ہے کہ اس کوتاہی سے صرف نظر نہیں کیا جائے گا۔

کاشف حسن، الجامعۃ الاسلامیہ شانتاپرم کیرلا

سہ ماہی مجلّہ حیات نو موصول ہوا، میری خوشی کی انتہا نہیں کہ یہ مجلّہ تجزیاتی قوت سے لیس ہے۔ 'اپنی بات' میں فکری بحران اور آزادیٔ اظہار رائے پر گفتگو بے حد پسند آئی۔ مجلّہ کے سارے مضامین کافی دلچسپ اور معلومات افزا تھے۔ جنہوں نے مجھ پر فکر ونظر نے نہ جانے کتنے راستے وا کیے۔ جناب ایڈیٹر صاحب کو دل کی گہرائیوں سے اس کے لیے مبارکباد پیش کرتا ہوں اور خدا سے دعا کرتا ہوں کہ امت کے موجودہ فکری بحران کے ازالے کے سلسلے میں یہ مجلّہ اہم سنگ میل ثابت ہو۔ مسلمانوں کی پہلی بدقسمتی تو یہ رہی ہے کہ وہ حالات کے نتیجے میں جذباتی ہو کر رہ گئی اور وہ خوابوں کی دنیا میں جینے کی عادی ہوگئی ہے۔ دوسری طرف جو لوگ کچھ سمجھتے اور لکھتے ہیں انہوں نے بھی انسانیت کی اجتماعی صورت گری کو سامنے نہیں رکھا ہے۔ بحران کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہم نے ہمہ جہت تنزلی کے نتیجے میں اپنے آپ کو سماج سے کاٹ رکھا ہے۔ دوسری طرف مسلم مفکرین اور متفکرین نے مغرب کا ایک عجیب سے ہوّا بنایا ہوا ہے۔ میری نظر میں مغرب کو الزام دینا بنیادی طور پر مسخ شدہ اور شکست خوردہ ذہنیت کا کام ہے۔ انسان کی نفسیات ہے کہ اگر وہ کچھ کرنا نہ چاہے تو اپنے اس عمل کو کسی نہ کسی کے سر پھوڑتا ہے، اور مسلم ملی فکر نے اپنے فکری بحران کی تسکین کے لیے مغرب کا ہوّا بنایا ہوا ہے۔ ملی زوال، خلاصہ کے طور پر میں یہ سمجھتا ہوں کہ اہم حقائق اس طرح ہیں؛ امت میں فلسفیانہ سمجھ کا فقدان، فلسفہ علم وتعلیم کے سلسلے میں تنگ نظری، اور اسلام کو مخصوص کلچر بنا دینا وغیرہ۔ دعا کرتا ہوں کہ یہ مجلّہ اپنی آب وتاب کے ساتھ ان تمام لوگوں کے اذہان کو کھولنے کا ذریعہ بنے جو اس وقت امت کی ارتقائی سوچ کے درمیان حائل ہیں۔

جامعہ کے لیل ونہار

مصباح الباری فلاحی، استاذ شعبۂ اعلیٰ، جامعۃ الفلاح

انگلش ٹیچر ٹریننگ میں اساتذہ جامعہ کی شرکت

انوپ جہاں اپ لفٹ سوسائٹی، علی گڑھ کے زیر اہتمام چار روزہ مدرسہ انگلش ٹیچرس ٹریننگ پروگرام ۴ر تا ۷ر اپریل ۲۰۱۵ء کو یو جی سی اکیڈمک اسٹاف کالج، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں منعقد ہوا، اس ٹریننگ پروگرام میں جامعہ کے سات اساتذہ شریک ہوئے۔ شریک ہونے والے اساتذہ کی فہرست درج ذیل ہے۔

(۱) ماسٹر سید عبداللہ صاحب (شعبہ اعلیٰ طالبات)
(۲) مولانا رئیس احمد فلاحی صاحب (شعبہ اعلیٰ طلبہ)
(۳) ماسٹر کمال الدین فلاحی (شعبہ ابتدائی طلبہ)
(۴) ماسٹر محمد عاصم صاحب (شعبہ اعلیٰ طلبہ)
(۵) ماسٹر آفتاب عالم صاحب (شعبہ اعلیٰ طالبات)
(۶) ماسٹر خان عبداللہ صاحب (شعبہ اعلیٰ طلبہ)
(۷) جناب محمد قاسم صاحب (شعبہ کمپیوٹر)

جناب عبدالرشید اگوان صاحب کا جامعہ میں لکچر

۲۹ر اپریل ۲۰۱۵ء بروز چہار شنبہ ابو اللیث ہال میں بعد نماز مغرب جناب عبدالرشید اگوان صاحب کا لکچر بعنوان: ''ہندوستان کی ہندو تنظیمیں، ادارے اور شخصیات۔ جائزہ و مطالعہ'' ہوا۔ آپ نے تفصیل کے ساتھ ہندوستان میں کام کر رہی ہندو تنظیموں اور اداروں کے مقاصد وعزائم اور ان کی شخصیات وسرگرمیوں کا تذکرہ کیا۔ پروگرام کے آخر میں مہمان خصوصی نے طلبہ کے قیمتی سوالات کے تشفی بخش جوابات بھی دیئے۔

ڈاکٹر ظفر الاسلام خان صاحب کا جامعہ میں لکچر

۳۰/اپریل ۲۰۱۵ء بروز پنجشنبہ ابواللیث ہال میں بعد نماز مغرب جناب ڈاکٹر ظفر الاسلام خان صاحب کا لکچر بعنوان: ''بین الاقوامی پس منظر اور عالمی میڈیا'' ہوا۔ آپ نے اپنی گفتگو میں فرمایا کہ عالمی میڈیا میں مسلمانوں کا وجود تقریباً نہیں کے برابر ہے۔ کسی ملک یا قوم پر تسلط قائم کرنے کے لئے اس وقت میڈیا کے علاوہ کسی اور چیز کی ضرورت نہیں۔ مسلم طلبہ کو میڈیا کے میدان میں پوری قوت کے ساتھ آنا چاہئے اور جو عظیم خلا ہے اسے پر کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

کلیۃ البنات میں یک روزہ سیمینار

۱۲/اپریل ۲۰۱۵ء بروز دوشنبہ انجمن طالبات قدیم کلیۃ البنات کی جانب سے ایک روزہ سیمینار بعنوان ''تحریک آزادئ نسواں اور سماج پر اس کے اثرات'' منعقد ہوا۔ یہ سیمینار دو نشستوں پر مشتمل تھا۔ پروگرام کا آغاز محترمہ شمسیہ صالحاتی صاحبہ کی تذکیر سے ہوا۔ اس میں کل آٹھ مقالے پیش کئے گئے۔ پہلی نشست میں پیش کئے گئے مقالات کی فہرست درج ذیل ہے:

(۱) مغربی تہذیب اور اسلامی تہذیب میں فرق — محترمہ ثمینہ شہنواز فلاحی صاحبہ
(۲) غیر اسلامی طرز معاشرت اور اس کے نقصانات — محترمہ تمنا جبین صاحبہ
(۳) فارغات کی علمی و عملی زندگی جامعہ کے تناظر میں — محترمہ ذکیہ سنجری صاحبہ
(۴) خاندانی منصوبہ بندی اور اسلام — محترمہ آمنہ نسرین صاحبہ

دوسری نشست میں پیش کئے گئے مقالات کی فہرست درج ذیل ہے:

(۱) دینی تعلیم سے بے رغبتی اور نئی نسل کی بے راہ روی — محترمہ سلمیٰ خورشید فلاحی صاحبہ
(۲) مخلوط تعلیم کے نقصانات اور اس سے تحفظ کی شکلیں — محترمہ فرقانہ صاحبہ
(۳) اسراف و تبذیر اور اس کے نقصانات — محترمہ شہلا خالد صاحبہ
(۴) تحریک آزادی نسواں، منفی اور مثبت اثرات — محترمہ ہما یاسمین صاحبہ

پہلا سیشن محترمہ سلمیٰ جلیل صالحاتی صاحبہ کی صدارت میں ہوا، اور دوسرے سیشن کی صدارت محترمہ ساجدہ فلاحی صاحبہ نے فرمائی۔

پہلے سیشن کے خطبہ صدارت کے بعد ناظم جامعہ جناب مولانا محمد طاہر مدنی نے 'فارغات سے جامعہ کی توقعات' کے موضوع پر خطاب کیا۔ مولانا احسان الحق فلاحی صاحب نے 'سماج کی تعمیر میں فارغات کلیۃ البنات کا رول' کے موضوع پر خطاب کیا۔

کلیۃ البنات میں طالبات کا سالانہ تعلیمی مظاہرہ

۱۳/۱۴/اپریل ۲۰۱۵ء بروز دوشنبہ وسہ شنبہ کلیۃ البنات میں طالبات کا سالانہ تعلیمی مظاہرہ منعقد ہوا۔ افتتاحی کلمات مولانا نظام الدین اصلاحی نے پیش کئے۔ ناظم جامعہ جناب مولانا محمد طاہر مدنی نے طالبات کو قیمتی نصیحتوں سے نوازا۔ اس تعلیمی مظاہرہ میں طالبات نے تقاریر، نظمیں، مکالمے، مذاکرہ، پینل ڈسکشن، ڈبیٹ، فقہ وفتاویٰ، برجستہ تقاریر، سائنسی معلومات اور منظوم ڈرامے پیش کئے۔ بزم ادب کی بھی ایک نشست ہوئی اور طالبات نے اپنی ادبی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کیا۔

شیخ عبداللہ قحطانی کا جامعہ کی مسجد میں محاضرہ

۲۳/مارچ ۲۰۱۵ء بروز دوشنبہ بعد نماز مغرب جامعہ کی مسجد میں شیخ عبداللہ قحطانی (ریاض، سعودی عرب) کا ایک توسیعی لکچر بعنوان: ''شباب الامۃ الاسلامیۃ'' ہوا، آپ نے اپنی گفتگو میں طلبہ کو درج ذیل امور پر ابھارا: (۱) محنت کرنا (۲) اخلاق حسنہ اور اوصاف حمیدہ سے متصف ہونا (۳) جدید علوم کی تعلیم حاصل کرنا (۴) عربی زبان میں مہارت حاصل کرنا۔ آخر میں آپ نے طلبہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ ''اے گروہ نوجواں! تم سے امت کو بہت سی امیدیں وابستہ ہیں، تم مستقبل کے معمار ہو، اپنی ذمہ داریوں کو سمجھو''۔

شیخ علی مشعوف کا جامعہ کی مسجد میں محاضرہ

۲۴/مارچ ۲۰۱۵ء بروز سہ شنبہ جامعہ کی مسجد میں شیخ علی مشعوف (ریاض) کا ایک علمی محاضرہ بعد نماز مغرب ہوا، آپ نے اپنی گفتگو میں حضرت لقمانؑ کی اپنے فرزند ارجمند کے نام وصیت کو بہت ہی دلکش انداز میں پیش کیا۔ اخیر میں آپ نے بلاغت قرآنی پر بھی روشنی ڈالی۔ اور عربی اشعار سے طلبہ کو محظوظ کیا۔

مولانا اظہار احمد فلاحی کے بھائی کی رحلت

جامعہ کے استاد مولانا اظہار احمد فلاحی کے بڑے بھائی جناب عبداللہ صاحب ۲۴/اپریل ۲۰۱۵ء بروز جمعہ مغرب وعشاء کے درمیان اس دار فانی سے کوچ کر گئے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔ پسماندگان میں دولڑکے ہیں۔ آپؒ ہائیڈل رٹائرڈ تھے۔ پچپڑوا ضلع بلرام پور میں قیام پذیر تھے۔ عمر تقریباً ۷۰/سال تھی۔ شوگر کے مریض تھے۔ سیڑھی سے گرنے کے سبب دو ڈھائی مہینہ تک بستر پر رہے۔ اللہ آپ کے درجات کو بلند کرے، جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق

دے۔(آمین)

مجلس شوری منعقدہ ۹؍۱۰؍مئی ۲۰۱۵ء کے بعض اہم فیصلے

(الف) مجلس شوری کے فیصلے کے مطابق آئندہ سال سے مراحل تعلیم حسب ذیل ہوں گے:

(۱) ابتدائی:	۵؍سال
(۲) ثانوی:	۳؍سال
(۳) مولوی (ہائی اسکول):	۳؍کے بجائے ۴؍سال
(۴) عالمیت	۲؍سال
(۵) فضیلت	۳؍کے بجائے ۲؍سال

(ب) اس کے علاوہ نصاب تعلیم میں بھی کافی تبدیلیاں لائی گئیں ہیں، تفصیلات جامعہ کی ویب سائٹ پر موجود ہیں۔

(ت) تعلیمی سال ۱۶۔۲۰۱۵ء کے لئے طے شدہ شرح فیس:

نوعیت فیس	منظور شدہ
داخلہ فیس	200
تعلیمی،، (ابتدائی)	100
،، ،، (ثانوی)	150
،، ،، (اعلیٰ)	200
امتحانی،، (ابتدائی)	100
امتحانی فیس (ثانوی)	150
،، ،، (اعلیٰ)	200
لائبریری غیر بورڈر (سالانہ)	240
بورڈ سے زر ضمانت	2000
پیشگی فیس خوراک	1200
فرنیچر فیس برائے بورڈر طالبات	300
بجلی بورڈنگ و لائبریری فیس	2000
اسناد فیس (مولوی)	300
اسناد فیس (عالمیت)	500

اسنادفیس(فضیلت)	500
TC(ٹی سی)وغیرہ	100
داخلہ فارم	100
تجدید داخلہ فارم	50

فضیلت سے فارغ ہونے والے طلبہ کو الوداعی پارٹی

اس مناسبت سے تلاوت کلام پاک کے بعد طلبہ نے اپنے احساسات پیش کیے۔اور پھر اساتذہ وذمہ داران نے خطاب کیا۔مولانا نعیم الدین اصلاحی نے اپنی گفتگو میں فرمایا کہ اگر کوئی محنت نہیں کرے گا تو کچھ نہیں بن پائے گا۔مہتمم تعلیم وتربیت مولانا رحمت اللہ اثری فلاحی نے کہا کہ فارغ ہونے والے طلبہ جامعہ میں اپنا وقت دیں اور آپ جہاں کہیں بھی رہیں اسلام کا نمونہ پیش کریں۔نائب ناظم جامعہ مولانا مقبول احمد فلاحی صاحب نے کہا قرآن وسنت کی گہری بصیرت کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں مقصد حیات مل جائے۔ناظم جامعہ مولانا محمد طاہر مدنی نے اپنی گفتگو میں کہا کہ یہ احتساب کا موقع ہے اور فارغ ہونے والے طلبہ کے لیے یہ پیغام ہے ''وَ تَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَیْرَ الزَّادِ التَّقْوٰی ''۔مولانا محمد عمران فلاحی صاحب نے فرمایا کہ دوسرے تیسرے بیچ کے فلاحیوں نے انجمن قائم کی ، پھر آپ نے مقاصد انجمن کو بیان کرتے ہوئے کہا جامعہ کے مقاصد کے حصول کی کوشش کرنا، فلاحیوں کے مسائل حل کرنا اور جامعہ کا تعاون کرنا، مزید آپ نے انجمن طلبہ قدیم کی عملی چیزوں کو واضح کیا، اور فارغ ہونے والے طلبہ کو انجمن سے وابستگی اختیار کرنے کے لئے کہا۔مولانا ولی اللہ مجید قاسمی کی دعا پر نشست اختتام پذیر ہوئی۔

امسال جامعہ سے فضیلت سے فارغ یونے والے طلبہ درج ذیل ہیں:

(۱)عبدالرحمٰن طاہر (بلریاگنج) ۔(۲) محمد عارف سردار (پرتاپ گڑھ)۔(۳) متین اشرف (پیلی بھیت)۔(۴) محمد عدنان (سنبھل)۔(۵) شہاب ثاقب (بلریاگنج)۔(۶) محمد نعمان (الہ آباد)۔(۷) راشد ریاض (سنسری نیپال)۔(۸) محمد احمد اللہ (سدھارتھ نگر)۔(۹) خان فیصل نفیس (سدھارتھ نگر)۔(۱۰) محمد آصف فلاحی (میوات)۔(۱۱) محمد اسرافیل انصاری (سنسری، نیپال)

جمعیۃ الطلبہ کا انتخاب

۱۶راگست ۲۰۱۵ء بروز یک شنبہ ابواللیث ہال میں جمعیۃ الطلبہ کا انتخاب عمل میں آیا۔فضیلت دو سال کی ہونے کی وجہ سے اس بار عربی ہفتم کے بجائے عربی ششم کے طلبہ کو منتخب کیا گیا۔نئے ذمہ داران کچھ اس طرح ہیں:

سکریٹری	شاہ زیب
لائبریرین	محمد شاداب
معتمد خطابت	نثار احمد
معتمد تحریر	محمد ساجد انصاری
رسائل وجرائد	محمد عثمان
گیم	شمشیر عالم
صفائی وباغبانی	شاہد حسین

جامعہ میں داخلہ ٹسٹ اور نئے تعلیمی سال کا آغاز

جامعہ کے تعلیمی کلینڈر کے اعلان کے مطابق ۲۹/جولائی ۲۰۱۵ء بروز سہ شنبہ نئے تعلیمی سیشن کا آغاز ہوا۔ ۲/اگست ۲۰۱۵ء بروز یک شنبہ پہلا ٹسٹ ہوا، جس میں ۱۰۵/طلبہ اور ۱۶۲/طالبات نے کامیابی حاصل کی۔ سہولت کے پیش نظر دوسرے ٹسٹ کا اعلان ۵۰۰/روپے لیٹ فیس کے ساتھ کیا گیا، جس میں ۱۶/طلبہ اور ۱۵/طالبات کامیاب ہوئیں۔ ۸/اگست ۲۰۱۵ء بروز شنبہ سے باقاعدہ تعلیم کا آغاز ہوا۔

ناظم جامعہ کا طلبہ سے خطاب

۳/اگست ۲۰۱۵ء بروز یک شنبہ بعد نماز فجر جامعہ کی مسجد میں محترم جناب مولانا محمد طاہر مدنی صاحب نے طلبہ جامعہ سے خطاب کیا۔ آپ نے اپنے خطاب میں اتحاد پیدا کرنے پر زور دیتے ہوئے کہا کہ جزوی اور فروعی مسائل کے ذریعے ہم ایک دوسرے کی تحقیر نہ کریں، اس کے بعد دعوہ سنٹر میں مہمانوں کے ساتھ ناظم جامعہ مولانا محمد طاہر مدنی، نائب ناظم جامعہ مولانا مقبول احمد فلاحی اور مہتمم تعلیم وتربیت مولانا رحمت اللہ اثری نے گفتگو کی۔

جامعہ میں یوم آزادی

۱۵/اگست ۲۰۱۵ء بروز شنبہ ابو اللیث ہال میں ۶۹/ویں یوم آزادی کے موقع پر ایک پروگرام منعقد ہوا۔ افتتاحی گفتگو میں مولانا انیس احمد فلاحی، صدر شعبہ اعلی نے یوم آزادی کے موقع پر کہا کہ مسلمانوں میں داخلی انتشار کو ختم کرنے اور قومی شعور بیدار کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد محمد اشہد متعلم عربی چہارم اور شاہ زیب متعلم عربی ششم نے ''آزادی کی تاریخ: اسباب ومحرکات اور جائزہ'' کے عنوان پر

گفتگو کی۔ جناب مولانا عبدالعظیم فلاحی نے اپنی گفتگو میں ہندوستان کی آزادی میں مسلمانوں کی قربانیوں کا تذکرہ کیا۔ناظم جامعہ جناب مولانا محمد طاہر مدنی نے اپنی گفتگو میں کہا کہ آج نصاب تعلیم میں تبدیلی کی جارہی ہے۔مسلمانوں کے نام کومٹایا جارہا ہے۔اور ذرائع ابلاغ کے ذریعے غلط فہمیاں عام کی جارہی ہیں۔ یہ دونوں بہت ہی اہم ہتھیار ہیں،اس لیے طلبہ عربی،اردو اور انگریزی زبانوں میں محنت کریں،اورمہارت پیدا کریں،تاکہ میڈیا کے ذریعے اپنی بات دوسروں تک پہنچاسکیں۔اس کے بعد بحکم ناظم جامعہ قومی پرچم حسن البنا و مودودی ہاسٹل کے سامنے والے پارک میں لہرایا گیا۔

جامعہ میں دوروزہ تربیتی پروگرام

۶/۵ راگست ۲۰۱۵ء بروز چہارشنبہ و پنج شنبہ جامعہ میں معلمین ومعلمات کے لیے دوروزہ تربیتی پروگرام ابواللیث ہال میں منعقد ہوا۔حافظ احسان الحق فلاحی صاحب نے اپنی تذکیر میں فرمایا کہ ہرموقع پرہمیں اللہ کا شکرادا کرنا چاہیے۔افتتاحی کلمات میں ناظم جامعہ مولانا محمد طاہر مدنی صاحب نے پروگرام کی اہمیت وافادیت پرروشنی ڈالی اورکامیاب وناکام ہونے والوں کی صفات کا تذکرہ کیا۔

ڈاکٹر ابرار اعظمی نے بعنوان ''ریفریشر پروگرام: ضرورت واہمیت'' پرروشنی ڈالی۔ڈاکٹر افضال فلاحی (شبلی کالج) نے ''تدریس کے بنیادی اصول'' پراپنا لکچر پیش کرتے ہوئے فرمایا: ''بچوں کے اندر ہماری تدریس سے تبدیلی ہے تو ہم کامیاب ہیں ورنہ ناکام۔ پھر آپ نے تعلیم اورتدریس کے کچھ اصول بیان فرمائے۔

دوسرے اجلاس میں ڈاکٹر افضال فلاحی (شبلی کالج) نے ماڈل لیسن مع سوالات کے عنوان پر لکچر پیش کیا۔اس کے بعد ناظم جامعہ، مہتمم جامعہ، اورسابق صدرشعبہ اعلی مولانا نعیم الدین اصلاحی نے اپنی گفتگو رکھی،اس سیشن کے آخر میں مولانا انیس احمد فلاحی صدرشعبہ اعلی نے ماڈل لیسن کے عنوان پرایک حدیث کے حوالے سے اپنی گفتگو رکھی۔

تیسرے اجلاس میں مولانا محمد طاہر مدنی نے ''تعلیم وتربیت اوراسوہ نبوی'' کے عنوان پر اپنا لکچر پیش کیا۔آپ نے اپنی گفتگو میں فرمایا کہ معلم کے لیے بھی آپ ﷺ کی زندگی میں بہترین رہنمائی موجود ہے۔دوسرا لکچر مولانا انیس احمد فلاحی کا ''ہم نصابی سرگرمیوں'' کے عنوان پر ہوا۔اس کے بعد مولانا محمد طاہر مدنی نے ''شخصیت سازی میں استاذ کا کردار'' کے عنوان پر ایک لکچر پیش کیا۔آخری اجلاس میں مولانا نعیم الدین اصلاحی نے تدریس قرآن کا ماڈل لیسن کے عنوان سے لکچر پیش کیا۔مولانا مقبول احمد فلاحی نے ''نئے سال کا تعلیمی وتربیتی منصوبہ'' کے عنوان سے سال بھر کا منصوبہ پیش کیا۔اختتامی کلمات مہتمم تعلیم وتربیت مولانا رحمت اللہ اثری فلاحی نے پیش کیے۔

پروگرام کی کچھ جھلکیاں

اجلاس عام انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح

بتاریخ ۳۰/۳۱/ اکتوبر و یکم نومبر ۲۰۱۵ء

پہلا دن: ۳۰/ اکتوبر

خطبہ جمعہ

مولانا ولی اللہ سعیدی فلاحی (سکریٹری شعبہ تربیت و رکن مرکزی مجلس شوری جماعت اسلامی ہند)

پہلا سیشن (افتتاحی) بعد نماز جمعہ ۲:۳۰/ تا ۴:۰۰/ بجے

زیر صدارت: مولانا رضوان رفیقی فلاحی (صدر انجمن طلبہ قدیم)

تلاوت قرآن پاک:

ترانہ جامعہ:

استقبالیہ: مولانا ضمیر الحسن خاں فلاحی (ناظم اجلاس)

مہمانان خصوصی:

کنوینر:

بعد نماز عصر

نمائش کا افتتاح

دوسرا سیشن (تعارفی) بعد نماز مغرب ۶:۳۰/ تا ۸:۳۰/ بجے

زیر صدارت: مولانا ابوالمکارم فلاحی ازہری (سابق صدر انجمن)

رپورٹ انجمن: نمائندہ انجمن

تجاویز برائے انجمن: یونٹس کے نمائندے

کنوینر:

تیسرا سیشن (تعلیمی مظاہرہ)

زیر صدارت: مولانا رحمت اللہ اثری فلاحی (سابق صدر انجمن)

تعلیمی مظاہرہ: جمعیۃ الطلبہ جامعۃ الفلاح

کنوینر:

دوسرا دن: ۳۱/ اکتوبر
بعد نماز فجر تذکیر بالقرآن
پہلا سیشن (تعلیمی وتربیتی) صبح ۹:۰۰/ تا ۱۲:۳۰/ بجے
زیر صدارت: مولانا سید جلال الدین عمری صاحب (شیخ الجامعہ)
موضوع مذاکرہ: ''جامعۃ الفلاح کا نظام تعلیم وتربیت: ایک تجزیہ''
(بیس شرکاء)
کنوینر:
دوسرا سیشن (دعوتی) بعد نماز مغرب ۶:۳۰/ تا ۸:۳۰/ بجے
موضوع: ''ملک وملت کی موجودہ صورت حال اور ہماری ذمہ داریاں'' (تین خطابات عام)
زیر صدارت: مولانا نسیم غازی فلاحی صاحب (سابق صدر انجمن)
کنوینر:
تیسرا سیشن (ادبی) بعد نماز عشاء
زیر صدارت: مولانا سید راشد حامدی فلاحی
نظامت:
شعراء وادباء:
تیسرا دن: یکم نومبر
بعد نماز فجر تذکیر بالحدیث
پہلا سیشن (صحافتی) صبح ۸:۳۰/ تا ۱۰:۳۰/ بجے
زیر صدارت: جناب قاسم سید فلاحی (چیف ایڈیٹر روزنامہ خبریں)
موضوع: ''میڈیا کی اہمیت اور ہماری ذمہ داریاں''
(پندرہ شرکاء)
کنوینر:
دوسرا سیشن (اختتامی) صبح 11:00-12:30
زیر صدارت: ڈاکٹر ملک فیصل فلاحی (سابق صدر انجمن)
تأثرات: دس شرکاء تین تین منٹ
قراردادیں: نمائندہ انجمن
زادراہ:
ہدیہ تشکر: معاون ناظم اجلاس
کنوینر:

شعبہ جات کی تفصیلات

اجلاس کمیٹی کی میٹنگ (۲۸/اگست، دہلی) میں شعبہ جات کی تفصیلات کچھ اس طرح طے کی گئیں:

رابطہ کمیٹی (مہمانان خصوصی سے رابطے کے لیے):

ڈاکٹر ملک فیصل فلاحی (لکھنو)، ڈاکٹر رضوان رفیقی فلاحی

شعبہ نشر و اشاعت:

راشد حامدی فلاحی (دہلی)، معاونین: دانش ریاض فلاحی و شمشاد حسین فلاحی (دہلی)

استقبالیہ (استقبال، ٹرانسپورٹ، اور رجسٹریشن و اعلانات):

عبدالرحمٰن زریاب فلاحی (بلریا گنج)، معاونین: امیر فیصل فلاحی (بلریا گنج)، عمیر عالم فلاحی (دہلی)

اجتماع گاہ:

ڈاکٹر محمد افضل فلاحی (بلریا گنج)

اسٹیج:

آصف نواز فلاحی (دہلی)، معاون: محمد اکمل فلاحی (جامعۃ الفلاح)

قیام گاہ:

مولانا محمد عمران فلاحی (جامعۃ الفلاح)

مہمان خانہ (برائے مہمانان خصوصی):

اظہر الدین فلاحی (تلکہنا)، معاون: ڈاکٹر یونس فلاحی (بھساول)

طعام و طعام گاہ:

کمال الدین فلاحی (جامعۃ الفلاح)، معاونین: عبدالعظیم فلاحی (جامعۃ الفلاح)، عبدالسمیع فلاحی (ممبئی)

آب رسانی:

ماسٹر شاہ عالم فلاحی (جامعۃ الفلاح)

اسٹالس:

عبدالرحمٰن خالد فلاحی (جامعۃ الفلاح)، معاون: آفتاب عالم فلاحی (جامعۃ الفلاح)

دفتر انجمن و حیات نو:

سید راشد حامدی فلاحی (دہلی)، معاونین: عامر جمال فلاحی (دہلی)، عبدالرحیم غانم فلاحی (بلریا گنج)

نمائش:

نعیم غازی فلاحی (دہلی)، معاون: فیضان احمد فلاحی (بلریا گنج)،

صفائی ستھرائی:
معین الدین فلاحی (بلریا گنج) معاون: آصف فلاحی (بلریا گنج)

ریکارڈنگ:
ارشاد عالم فلاحی (دہلی)، معاون: ساجد خلیل (دہلی)

پریس و میڈیا:
فلاح الدین فلاحی (دہلی)، معاونین: احتشام الحسن فلاحی (دہلی)، مصباح الباری فلاحی (جامعۃ الفلاح)

لائٹ اینڈ ساؤنڈ:
فیضان احمد فلاحی (بلریا گنج)، معاون: شیر افگن فلاحی (بلریا گنج)

واچ اینڈ وارڈ:
جرار احمد فلاحی (بھاواپور)، معاونین: احمد کلیم فلاحی (بلریا گنج)

مالیات کمیٹی:

دھلی: نعیم غازی فلاحی، وشمشیر حسین فلاحی

ممبئی: عبدالبر اثری فلاحی وادہم فلاحی

سعودی عرب: انعام اللہ فلاحی وعزیر ملک فلاحی

قطر: محمد اکرم فلاحی وفیاض احمد فلاحی

یو اے ای: موسیٰ کلیم فلاحی واکرام الرحمٰن فلاحی

کویت: محمد سموئیل فلاحی وعمر فخری فلاحی

اعظم گڑھ واطراف: محمد افضل فلاحی وکمال الدین فلاحی

لکھنؤ: ملک فیصل فلاحی وزبیر ملک فلاحی

علی گڑھ: ضیاء الدین ملک فلاحی ومحی الدین ساجد فلاحی

بیرون ملک فالواپ کے لیے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔رضوان رفیقی فلاحی (صدر انجمن)
اندرون ملک فالواپ کے لیے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔انعام اللہ فلاحی (دہلی)

فلاحی برادران سے ناظم اجلاس کی خط و کتابت

اجلاس عام سے متعلق ناظم اجلاس مولانا ضمیر الحسن خاں فلاحی کی جانب سے مستقل فلاحی برادران کو انفرادی واجتماعی طور پر اجلاس کی تفصیلات سے واقف کرایا جا رہا ہے۔ یونٹس کے ذمہ داران، عام فلاحی برادران، مختلف شعبوں کے ذمہ داران اور پھر کچھ عمومی قسم کے خطوط اور سرکلر مستقل ارسال کیے جا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ حتی المقدور فون اور سوشل میڈیا و پرنٹ میڈیا وغیرہ سے بھی اجلاس کی تشہیر کی جا رہی ہے۔

نمائش سے متعلق کچھ ہدایات

فلاحی برادران کے نام جناب نعیم احمد غازی فلاحی صاحب کی تحریر

محترم فلاحی برادران

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اللہ رب العزت سے دعا گو ہوں کہ ہم سب کو اپنی حفظ وامان میں رکھے اور ہمارے وجود کو ملک وملت کے لیے باعث خیر بنائے۔

جیسا کہ آپ کے علم میں یہ بات آچکی ہوگی کہ اس سال ۳۰/۳۱/اکتوبر و یکم نومبر کو منعقد ہونے والے اجلاس عام کے موقع پر انجمن نے ایک نمائش لگانے کا فیصلہ کیا ہے جس میں فارغین جامعہ کی ادبی، فکری، علمی، صحافتی، سماجی اور دعوتی کاوشوں کو منظر عام پر لایا جائے گا۔

اس نمائش کے سلسلے میں کچھ ضروری باتیں حسب ذیل ہیں...

1) یہ نمائش صرف فلاحیوں کے لیے مختص ہے، یعنی اس میں صرف فلاحیوں کی تخلیقات وتالیفات اور ضروری تفصیلات پیش کی جائیں گی۔

2) اس نمائش کے لیے ڈاٹا اکٹھا کرنا ایک بڑا مسئلہ ہے۔ اگر ہم خود بھی چاہیں تو کچھ حد تک مختلف مکتبوں اور دیگر ذرائع سے فلاحی برادران کے ذریعہ تصنیف کردہ اور ترجمہ وترتیب کردہ کتابوں نیز ان کی ادارت میں نکلنے والے رسالوں اور دیگر تفصیلات کو جمع کر سکتے ہیں، لیکن اس صورت میں بہتوں کے چھوٹ جانے کا اندیشہ ہے، جبکہ ہماری خواہش ہے کہ جملہ فلاحیوں کی کاوشوں کو منظر عام پر لایا جائے، اس لئے انجمن نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ کنوینر اور اس کے معاونین ہر اس فلاحی سے رابطہ کریں گے جو تصنیف وتالیف اور ادارت وصحافت یا ترجمہ کے میدانوں میں مصروف ہو، اور گزارش کی جائے گی کہ وہ اپنی تمام مطبوعات کی کم از کم ایک کاپی بذریعہ کوریئر یا بذریعہ وی پی یا حسب سہولت کسی بھی ذریعہ سے درج ذیل پتہ پر ارسال کرنے کی زحمت گوارا کریں:

Asif Nawaz, D-109, 1st Floor, Abul Fazal Evclave,
Jamia Nagar, Okhla, New Delhi-110025

3) جملہ فلاحی برادران سے گزارش ہے کہ ۱۰/اکتوبر تک اپنی مطبوعات کو ارسال کرنے کی کوشش کریں۔

4) جو بھی پوسٹل اخراجات آئیں گے انجمن کی جانب سے ان کی ادائیگی کی جائے گی۔

5) وہ رفقاء جو دہلی واطراف میں مقیم ہیں اگر چاہیں تو اپنی مطبوعات دیئے گئے پتہ پر خود بھی پہونچا سکتے ہیں.

6) مزید معلومات کے لیے atqnumaish2015@gmail.com پر رابطہ کر سکتے ہیں، اور اس کے علاوہ عزیزم آصف نواز فلاحی سے بذریعہ موبائل (9013228794) بھی رابطہ کیا

جا سکتا ہے۔ ذیلی یونٹوں کے ذمہ داران سے گذارش ہے کہ وہ اپنے علاقے اور اطراف کے فلاحی برادران سے اس سلسلے میں ملاقاتیں کریں، انہیں اس سے مطلع فرمائیں، اور مواد کی فراہمی میں ہمارا ممکنہ تعاون فرمائیں۔

7) اس کے لیے ایک پروفارما بھی تیار کیا گیا ہے، اس میں اپنی تفصیلات بھر کر ارسال فرمائیں، پروفارما بذریعہ ای میل مذکورہ ای میل سے یا اپنے صدر یونٹ سے حاصل کرلیں۔

7) جو ساتھی اپنے ایم فل یا پی ایچ ڈی کی تھیسس یا ڈسرٹیشن اس نمائش کے ذریعہ منظر عام پر لانا چاہتے ہیں، وہ حسب سہولت سافٹ کاپی یا ہارڈ کاپی ارسال فرمانے کی زحمت کریں۔

7) یہ نمائش کے تعلق سے ابتدائی سرکلر ہے، اس سے متعلق آئندہ تفصیلات بھی آپ کی خدمت میں پیش کی جاتی رہیں گی۔

8) اس کے علاوہ ایک اہم گزارش یہ ہے کہ اس نمائش کے سلسلے میں آپ کے ذہن میں کچھ تجاویز ہوں تو مذکورہ ای میل کے ذریعہ ہمارے ساتھ ضرور شیئر کریں۔

کنوینر (نمائش)
نعیم احمد غازی (دہلی)
9810156757

مدیر حیات نو کا دورۂ مہاراشٹر

مدیر حیات نو ابوالاعلی سید سبحانی نے مہاراشٹر کے اپنے تنظیمی دورے کے دوران اورنگ آباد، مالیگاؤں اور بھساول کے فلاحی برادران سے ملاقات کی، اور اجلاس سے متعلق تفصیلات ان کے ساتھ شیئر کیں، نیز اجلاس میں شرکت کے لیے انفرادی طور پر جملہ فلاحی برادران کو مدعو بھی کیا۔

علی گڑھ اور دہلی میں اجلاس سے متعلق انجمن کی میٹنگ

دہلی اور علی گڑھ یونٹ میں اجلاس کے تعلق سے فلاحیوں سے رابطہ کرنے کا کام مستقل جاری ہے۔ دہلی میں برادر شمشیر حسین فلاحی نے ایک سے زائد بار یہاں موجود فارغین جامعہ کے ساتھ میٹنگ رکھی اور اجلاس عام میں زیادہ سے زیادہ شرکت اور اس سلسلے میں تعاون پر گفتگو کی۔

علی گڑھ میں ۶ ستمبر کو سکریٹری انجمن و ناظم اجلاس مولانا ضمیر الحسن خاں فلاحی کی موجودگی میں وہاں موجود فارغین کی نشست بلائی گئی۔ نشست کا آغاز مولانا ضمیر الحسن خاں فلاحی کے تذکیری کلمات سے ہوا۔ اس کے بعد ڈاکٹر ضیاء الدین ملک فلاحی، رکن شوری انجمن طلبہ قدیم نے اجلاس کی تفصیلات پیش کیں، اور اس سلسلے میں علی گڑھ میں موجود فلاحی برادران کی جانب سے زیادہ سے زیادہ تعاون اور دلچسپی کی درخواست

کی، اور وہاں جانے کے لیے پہلی فرصت میں ٹکٹ نکلوانے کی جانب متوجہ کیا، دعا پر نشست کا اختتام ہوا۔

برادر صلاح الدین ایوب سبحانی کو پی ایچ ڈی کی ڈگری ایوارڈ

برادر صلاح الدین ایوب سبحانی کو جامعہ ملیہ اسلامیہ سے ''ہندوستان اور چین کے مابین تجارت کا جنوبی اور مشرقی ایشائی ممالک پر اثر'' کے عنوان پر پی ایچ ڈی کی ڈگری ایوارڈ کی گئی۔ موصوف کو یہ ڈگری جامعہ کے مولانا محمد علی جوہر اکیڈمی آف انٹرنیشنل اسٹڈیز سے ایوارڈ ہوئی ہے۔ آپ نے اپنی تحقیق اکیڈمی کے کارگزار ڈائرکٹر شری پرکاش کی نگرانی میں مکمل کی ہے۔ ڈاکٹر صلاح الدین ایوب سبحانی نے ۲۰۰۱ء میں جامعۃ الفلاح سے عالمیت کرنے کے بعد جامعہ ملیہ اسلامیہ سے ۲۰۰۴ء میں اکنامکس سے بی اے، ۲۰۰۶ء میں اکنامکس سے ایم اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد جامعہ کی اکیڈمی آف انٹرنیشنل اسٹڈیز میں داخلہ لیا، اور وہاں سے ۲۰۰۹ء میں بین الاقوامی تجارت میں ایم فل بھی کیا۔ یونیورسٹی گرانٹ کمیشن کی طرف سے آپ کو مولانا آزاد فیلوشپ بھی ایوارڈ ہوئی۔ موصوف کی اس کامیابی کو یقیناً اہل علم کے درمیان قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا اور اس سے مدارس کے فارغین کو حوصلہ ملے گا۔ ادارہ حیات نو موصوف کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہے۔

برادر رضوان رفیقی فلاحی کو پی ایچ ڈی کی ڈگری ایوارڈ

صدر انجمن طلبہ قدیم برادر رضوان رفیقی فلاحی کو ماہ اگست کے اواخر میں لکھنؤ یونیورسٹی (لکھنؤ) سے ''سید قطب شہید کے ادبی رجحانات'' کے موضوع پر وہاں کے شعبہ عربی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی گئی۔ موصوف نے ۱۹۹۶ء میں جامعۃ الفلاح سے فضیلت کی سند حاصل کی، اور وہیں تدریسی خدمات انجام دینے لگے۔ بعد میں مزید تعلیم کے لیے جامعۃ الامام ریاض چلے گئے، اور وہاں سے بی اے کیا۔ سعودی عرب سے واپسی کے بعد آپ ایس آئی او آف انڈیا کے مرکزی سکریٹری اور پھر ایس آئی او یوپی مشرق کے صدر حلقہ رہے۔ اسی دوران آپ نے لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبہ عربی سے ایم اے بھی کیا۔ موصوف اس وقت ہیومن ویلفیئر فاؤنڈیشن سے ہمہ وقتی طور پر وابستہ ہیں۔ ادارہ حیات نو موصوف کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہے۔

ادارہ حیات نو کی جانب سے اظہار تعزیت

ادارہ حیات نو کو یہ افسوسناک خبر موصول ہوئی ہے کہ برادر مبین فلاحی جو ممبئی میں کافی دنوں سے سخت علیل چل رہے تھے اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ اسی طرح پروفیسر خالد حامدی فلاحی کے صاحبزادے اور جناب راشد حامدی فلاحی صاحب کے بھتیجے برادر عابد حامدی ماہ رمضان میں ایک ٹرین حادثے میں جاں بحق ہو گئے۔ اسی طرح برادر احمد ریحان فلاحی (منگراواں، اعظم گڑھ) کی والدہ اور مولانا اظہار احمد فلاحی (جامعۃ الفلاح) کے بھائی گزشتہ دنوں اس دار فانی سے کوچ کر گئے، ادارہ مرحومین کے لیے دعائے مغفرت اور پسماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کرتا ہے۔

اردو دنیا میں پہلی بار

منفرد و ممتاز شاعر عرفان صدیقی پر مستند، وقیع اور دستاویزی پیش کش

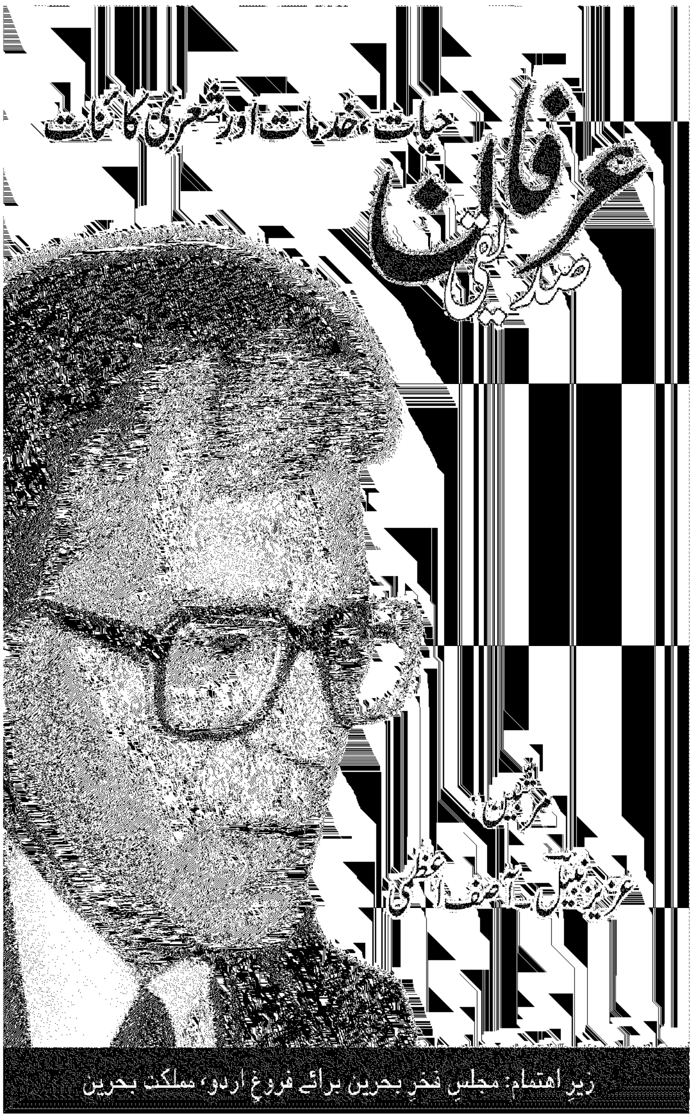

Email: aziznabeelx@gmail.com, asifazmi@hotmail.com